سعادت حسن منٹو



تلخ، ترش اور شیریں

تلخ، تُرش

اور

شیریں

سعادت حسن منٹو

مکتبہ شعروادب، سمن آباد لاہور

ناشر ــــ نواز چودھری
مطبع ــــ
قیمت ــــ

ترتیب

دیواروں پر لکھنا

کل ایک دیوار پر یہ حکم لکھا نظر آیا "اس دیوار پر لکھنا منع ہے"۔ میں نے سوچا جب دیوار کے مالک کو اپنی دیوار پر کسی قسم کی تحریر پسند نہ تھی تو یہ حکم ہی کیوں لکھوایا۔ غالباً اسی نفسیاتی غلطی کا نتیجہ تھا کہ وہ ساری دیوار بے شمار چھوٹے اور موٹے بدخط اور خوشخط حروف سے بھری ہوئی تھی۔ لیکن شہر کی قریب قریب ہر دیوار بغیر کسی نفسیاتی تحریک کے لکھنے لکھانے کا نشانہ بن رہی ہے جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ کہ دیواروں پر لکھنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ جس طرح ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، اسی طرح دیواروں پر لکھتے بھی ہیں۔

میری بچّی ہے ڈیڑھ برس کی۔ اُس نے مجھے کاغذوں پر لکھتے دیکھا ہے۔ لیکن جب اُس کے ہاتھ میں پہلی بار پنسل آئی تو اس نے کاغذ کے بجائے میرے کمرے کی دیواریں ہی کالی کیں۔ وہ اس شغل میں مصروف تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ دیواروں پر سیاہ لکیریں

کھینچ کر ایک عجیب متم کی تسکین محسوس کر رہی ہے۔ شروع شروع میں انسان اس تسکین و تفریح ہی کے لئے لکھتا ہے۔ لیکن بعد میں اپنا پیٹ پالنے کے لئے لکھتا ہے۔ ابتدا میں تو اُس کی تحریر صرف دیواریں کالی کرتی ہے۔ لیکن آگے چل کر اس کی تحریر دیواریں بناتی بھی ہے اور ڈھاتی بھی ہے۔ کوئی چغتائی بن جاتا ہے، کوئی اقبال — اور بعض دیواروں پر لکھ ایسی مصوری اور شاعری کرتے ہیں کہ انسان دیکھ کر نقش بہ دیوار ہو جاتا ہے۔

کتابی ادب ہے، اخباری ادب ہے، رسائلی ادب ہے — اسی طرح دیواری ادب بھی ہے۔ کاغذ پہ صرف کلیجہ نکال کے رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن دیوار پہ آپ کلیجہ، گردے، دل، پھیپھڑے بھی نکال کے رکھ سکتے ہیں — اسکولوں، کالجوں اور ہنڈوؤں کے باتھ روموں میں جائیے۔ اُن کی دیواروں پر آپ کو جملہ اعضائے انسانی کی تصویریں نظر آ جائیں گی۔

دیواروں پر تو خیر انسان لکھتا ہی ہے۔ لیکن بیت الخلا کی دیواروں پر ضرور لکھتا ہے۔ مسجد میں چلے جائیے۔ اس کے غسل خانے کی دیواروں پر بھی آپ کو ترقی پسند ادب اور ترقی پسند مصوری بکھری نظر آئے گی۔ یہی نہیں آپ ان دیواری تحریروں سے ضروری معلومات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مسجد کے موذن صاحب کس طبیعت کے مالک ہیں۔ امام صاحب کو کون کون سے کھانے مرغوب ہیں۔ اسکول کا کون کون سا اُستاد میر تقی میر کا تتبع کرتا ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب مقبول ہیں یا نہیں۔ اسی طرح کی اور سینکڑوں باتیں آپ کو ایک ہی نشست میں ان دیواروں کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

ایک کہانی کے سلسلے میں بمبئی کی ایک فلم کمپنی سے میرا معاہدہ ہو رہا تھا۔ اگریمنٹ پر صرف دستخط کرنے باقی تھے کہ مجھے باتھ روم جانا پڑا۔ سامنے دیوار پر زرد چاک سے یہ لکھا ہوا نظر آیا۔ اور تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن پگار کیوں نہیں دیتے؟ ــــ پگار کا مطلب ہے تنخواہ ــــ میں نے اگریمنٹ پر دستخط نہ کئے ــــ اس فلم کمپنی میں اور سب ٹھیک تھا۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ بالکل درست تھی۔ لیکن کام کرنے والوں کو چھ مہینے سے تنخواہ نہیں دی گئی تھی۔

دیوار پر لکھنا ایسا ہی ہے جیسے سربازار آواز بلند کر کے کوئی اعلان کر دیا جائے۔ لیکن بیت الخلا کی دیواروں پر وہ علوم لکھے جاتے ہیں۔ جن کے مطالعے کے لئے سکون تنہائی اور اطمینانِ قلب درکار ہوتا ہے۔ مختصر نشست ہی میں آپ ان چھوٹی چھوٹی اباریوں سے روزمرہ کی زندگی کے سینکڑوں اسرار معلوم کر سکتے ہیں۔ بھاری بھرکم کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں ــــ ذرا گردن اٹھائی اور ہیولک ایلس کی چاروں جلدوں کا نچوڑ دیکھ لیا۔

غالب کا ایک شعر ہے ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

چونکہ ایسی دیواروں پر لکھتے وقت دمِ تحریر فرشتے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے پکڑے نے پکڑانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دیواری ادب اور مصوری کی یہ شاخ حکومت کے احتساب اور اس کے خوف سے بالکل پاک رہی ہے۔ انسان ان دیواروں پر

تعزیرات کی تمام دفعات سے محفوظ ہو کر اپنے خیالات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ تمام ــــ ملمع کاریوں سے مبرا۔

اسی چار دیواری کے ایک کونے میں عرصہ ہوا یہ فکر خیز تحریر دیکھی تھی "تمہارے ہاتھ بھی کیسے کیسے کام کرتے ہیں"۔ اور دیواری مصوری کی اس خاص صنف میں آج کے نقاد موڈرن سُوئی ری لسٹک مصوری کی نمایاں جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

دیواروں پر لکھنے اور نقش و نگار بنانے کے لئے خاص روشنائی یا رنگوں کی ضرورت نہیں۔ کوئلہ، کھریا مٹی، نیم پختہ اینٹ کا ٹکڑا، دودھ پتھری، گیری، چونا، کتھا، تارکول ــ ان میں سے جو بھی inspiration کے وقت موجود ہو۔ آپ استعمال کر سکتے ہیں۔ قلم اور برش نہیں تو انگلی ہی سے کام لیا جا سکتا ہے اور اگر کوئی بھی ذریعہ میسّر نہیں تو ناخنوں ہی سے کرید کرید کر آپ اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں۔

فارسی محاورہ ہے۔ دیوار ہم گوش دارد۔ لیکن جب دیواروں پر لکھا جاتا ہے تو اس کے کانوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ لکھنے والے اصل میں دیوار کے کانوں ہی میں سرگوشیاں کرتے ہیں تاکہ کان کی یہ کچی چیزیں جو کچھ سُنیں دوسروں تک پہنچا دیں۔

عرصہ ہوا لاہور سے پشاور تک سفر کرتے ہوئے فرنٹیر میل کے ایک ڈبّے کی چوبی دیوار پر میں نے یہ تحریر دیکھی تھی "بجلی کے تاروں پر ابابیلوں کے جوڑے بیٹھے ہیں ــ لیکن میرا پہلو خالی ہے ــ مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا" ــ ڈیڑھ مہینے کے بعد اتفاق سے لاہور واپس آتے ہوئے مجھے اسی ڈبّے میں جگہ ملی۔ اس عبارت

کے نیچے نسوانی خط میں یہ الفاظ لکھے تھے "بدنصیب ہے وہ انسان جس کا دل محبت سے خالی ہے"

کیا عجب کہ یہ دو نو دل جو محبت سے خالی تھے۔ ایک روز وقت کے تاروں پر مل بیٹھے ہوں۔

ہوٹلوں میں آپ نے اکثر دیواروں پر یہ شعر دیکھا ہوگا ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اگر آپ غریب الوطن ہیں تو یہ تحریر دیکھ کر یقیناً آپ کا دل محزون ہو جائے گا۔

دیواروں سے بعض اصحاب ڈائری کا کام بھی لیتے ہیں ٹیلیفون کے برابر کی دیوار پر آپ نے کئی نمبر اور نام یادداشت کے طور پر لکھے ہوئے دیکھے ہوں گے۔ ہوسٹل کے کمروں کی دیواروں پر ایسی تحریریں عام دکھائی دیتی ہیں۔ $\frac{9}{5}$ کو دودھ شروع کیا گیا۔ دھوبی کو کپڑے دیئے گئے۔ $\frac{2}{4}$

بمبئی کے ایک ہوٹل میں جہاں عام طور پر جہاز کے خلاصی ٹھیرتے تھے۔ میں نے بادبانوں، مستولوں اور جھنڈوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ ذیل کی تحریریں دیکھیں جو اپنا مطلب خود واضح کرتی ہیں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

فرانس — فرانس — فرانس — میموزیل نینی . . .

ہائے!

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا۔

پانچوں وقت نماز پڑھا کرو

او جانے والے بالموا — لوٹ کے آ، لوٹ کے آ

بقلم خود جان محمد 2/9/47

بقلم خود لکھنے کا شوق بہت زیادہ ہے۔ شاید اس لئے کہ اس سے وقتی طور پر انسان کی خودی کی تسلی ہو جاتی ہے جس طرح ہمالہ کی چوٹیاں مسخر کرنے پر سیاح اپنے جھنڈے گاڑ آتے ہیں۔ اسی طرح کوئی نئی جگہ دیکھنے پر ہم چھوٹے چھوٹے انسان اپنا نام لکھ آتے ہیں اگر آپ کو کبھی قطب صاحب کی لاٹھ کی آخری منزل تک پہنچنے کا اتفاق ہوا ہے۔ تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں تانبے کے کڑے اور پتھروں پر ہزاروں بقلم خود کندہ ہیں۔ امریکی، روسی اور انگریز سپاہیوں نے جب رائخ شٹاگ کی عمارت پر قبضہ کیا تو اس کی دیواروں پر اپنا نام لکھنے میں فاتحانہ مسرت محسوس کی۔

دیواروں پر قسمت بھی آزمائی جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے ہوٹلوں، گھروں اور اسکولوں کی دیواروں پر چار لکیروں میں گھرے ہوئے چلیپا کے نشان اور دائرے اکثر دیکھے ہوں گے حساب کے سوال بھی حل کئے جاتے ہیں۔ سیاست کی گتھیاں بھی سلجھائی جاتی ہیں اور اپنے دل کی بھڑاس بھی نکالی جاتی ہے۔

مجھے مشہور ایکٹر اشوک کمار کے باتھ روم میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کی ایک دیوار پر بے شمار گھوڑوں کے نام، ان کے وزن اور ہینڈی کیپ وغیرہ لکھے تھے۔ اشوک نے

مجھ سے کہا کہ ریس میں جانے سے پہلے وہ اسی دیوار پر سے اپنے لئے ٹپ نکالا کرتا ہے۔

قلوپطرہ کو ابھی بیٹھا برس لگا تھا۔ جب اسکندریہ میں یہ رواج عام تھا کہ مشتاق اپنی پسندیدہ عورت کا نام دیوار پر لکھ دیتے تھے۔ اپنا نام پڑھ کر عورت سولہ سنگھار کئے اپنے عاشق کے انتظار میں وہاں کھڑی رہتی تھی۔ انسان کے دیواروں پر لکھنے اور نقاشی کرنے کے اس فطری شوق ہی کی بدولت اجنتا اور ایلورا کے فرسکو نظر آتے ہیں۔ اس کی معراج دیکھنا ہو تو روما کے عظیم الشان کلیساؤں کی دیواروں کے نہ مٹنے والے نقش موجود ہیں۔ سچ پوچھئے تو یورپ کے فنِ مصوّری کا نصف بہتر آپ کو وہاں کی دیواروں ہی پر ملے گا اور مغلوں کی بے مثل خطّاطی۔ نقاشی اور مصوّری کے نمونے بھی دیواریں ہی پیش کریں گی۔

اشتہار بازی میں بھی تحریریں پیش پیش ہیں۔ شہر لاہور کی شاید ہی کوئی ایسی دیوار ہو۔ جس پر آپ کو اشتہار لکھا ہوا نظر نہ آئے۔ بال صفا پوڈر سے لیکر بال اُگانے کے تیل تک جتنی دوائیں ہیں۔ آپ ان کا اشتہار دیواروں پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

پطرس صاحب نے اپنے مشہور مضمون "لاہور کا جغرافیہ" میں دیواروں کی سطح پر لکھے ہوئے اشتہاروں کے فوائد بیان کئے ہیں۔

اُن دائمی اشتہاروں کی بدولت اب خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لئے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا

تھا اور لوٹنے تک وہاں اہلِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بحروفِ جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں "بجلی پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ خالص گھی کی مٹھائی، امتیاز علی تاج کا مکان ہے۔ کرشنا بیوٹی کریم، شالامار باغ کو۔ اور "کھانسی کا مجرب نسخہ"۔ جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔"

بمبئی میں کارپوریشن نے ایک بہت لمبی دیوار جو کوئینز روڈ پر واقع ہے اور برقی ریل کی پٹڑی کے متوازی دور تک چلی گئی ہے۔ ان اشتہاروں کے لئے مخصوص کر دی ہے۔ اس دیوار کے پیچھے پارسیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا قبرستان اور ہندوؤں کا شمشان ہے۔ معلوم نہیں مذہبی نقطۂ نظر سے بمبئی کارپوریشن کی حرکت درست ہے یا نادرست مگر یہ دیوار جس پر ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک فلموں کے بڑے بڑے اشتہار چپکے ہیں ایک عجیب و غریب تضاد پیش کرتی ہے ___ عقب میں ہزاروں انسان دفن ہیں۔ لیکن پیشانی پر پری چہرہ نسیم بانو کی بڑی تصویر نظر آتی ہے ___ ذرا آگے بڑھئے تو موٹے موٹے حروف میں "ہنسو ہنسو اے دُنیا والو" کا اشتہار دکھائی دیتا ہے۔ دیوار کے پیچھے جلتی ہوئی چِتا سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ لیکن سامنے نیو تھیٹرز کے فلم "زندگی" کا شوخ رنگ اشتہار چمک رہا ہے۔

پچھلے دنوں السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں اسی دیوار کی متعدد رنگین تصویریں ایک مضمون کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ جس میں اشتہاری مصوری کی اس جدید صنف کو بہت

سراہا گیا تھا۔ لیکن بچپن میں ہم جب چھو چھو گلیریاں۔ دوتیریاں دومیریاں تک کا دلچسپ کھیل کھیلتے تھے اور دیواروں پر کوئلے سے اَن گنت لکیریں کھینچتے تھے تو بزرگوں نے ہمارے اس فعل کی ہمیشہ مذمت کی۔

ادھر روس میں ان دیواری تحریروں نے انقلاب میں بیش از بیش حصّہ لیا —— پریس پر حکومت کا بہت بڑا احتساب تھا۔ اس لئے دیواروں ہی کے ذریعے سے اخباروں اور پمفلٹوں کا کام لیا گیا۔ اس ذریعے نے بعد میں شکل بدلی اور مزدوروں کا "دیواری اخبار" یا "وال پیپر" بن گیا۔

جب تک دیواریں سلامت ہیں۔ ان پر انسان لکھتا اور نقش و نگار بناتا ہی رہے گا۔ لیکن پچھلے دنوں انسان نے ایک قدم ترقی کی طرف بڑھایا اور فضاؤں پر لکھنا شروع کیا۔ پیئرز سوپ بنانے والوں نے ایک ہوا باز کی خدمات حاصل کیں جس نے جہاز کی دم سے گاڑھا دھواں چھوڑ کر کچھ اس طرح قلابازیاں کھائیں کہ فضا میں اس صابن کا دھوئیں دھار نام کچھ عرصے کے لئے معلّق ہو گیا۔

بمبئی میں جب اس فضائی اشتہار بازی کا مظاہرہ ہوا تو کارپوریشن نے پیئرز سوپ والوں سے فضا استعمال کرنے کا کرایہ طلب کیا۔ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ فیصلہ کارپوریشن کے حق میں ہوا کہ فضا بھی اس کے حلقۂ انتظام میں شامل ہے۔

ناک کی قسمیں

خدا نے جس طرح پانچ انگلیاں یکساں نہیں بنائیں۔ اسی طرح انسانوں کی ناک بھی ایک سی نہیں بنائی۔ بعض چپٹی ہوتی ہیں بعض اونچی، کچھ موٹی، کچھ پتلی، چھوٹی اور لمبی اور بعض اوقات اتنی لمبی کہ ؎

آئی جو اُن کی ناک تو آتی چلی گئی

اس ناک کے مقابلے میں پکی سی ناک ہوتی ہے۔ چہرے پر جو صرف ناک کے نشان کا کام دیتی ہے۔ ایسی ناکوں کے مالک بڑے کٹر قسم کے رجائی ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسی اُمید کے سہارے سانس لیتے رہتے ہیں کہ ایک روز صبح اٹھتے ہی یہ بے معلوم سا نشان ستواں ناک میں تبدیل ہو جائے گا۔

عام استعمال میں پھکواں یعنی پھولی ہوئی چپٹی بیٹھی، ستواں اور اونچی ناک ہی آتی ہے۔ لیکن شاعروں کو صرف ستواں ناک ہی بھاتی ہے۔ کبھی اسے اُپی تلوار سے تشبیہ دی

جاتی ہے۔کبھی کتارا یعنی املی کی پھلی سے۔لیکن تلوار اور ناک کا رشتہ کچھ زیادہ ہی استوار ہے۔اس لیے کہ دشمنی کے وقت تلوار ہی اس کے درپے ہوتی ہے۔دشمن کی ناک کاٹنے کا تو رواج عام ہے۔

یو۔پی کے دیہاتوں میں خوبصورت ناک کو سُوئے سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔کسی نے کہا ہے ہمارے سبزہ باغ میں سوا چونچ کہتے ہیں۔شاید نظر کے تیروں کے علاوہ وہاں ناک کے سوئے بھی عاشقوں کے دل میں پیوست ہوتے ہوں۔

پنجابی شاعر تشبیہہ دینے کے معاملہ میں ہمیشہ ترقی پسند رہے ہیں۔چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے "نک تھوم دی تُری" یعنی ناک لہسن کی تُری ہے۔ہو سکتا ہے شاعر نے اپنے معشوق کے چہرے کو پکی ہوئی دال سمجھ کر لہسن کا بگھار دے دیا ہو پنجابی شاعری کے ناخدا حضرتِ وارث شاہ پنجاب کی مثالی معشوقہ ہیر سیال کا سراپا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہونٹھ سُرخ یاقوت جیوں لال چمکن، ٹھوڈی سیب ولایتی سار وچوں

نک الف حسینی دا پپلا ئے، زُلف ناگ خزانے دی بار وچوں

ہیر کی اس ناک کو اگر اُپی تلوار، املی کی پھلی، لہسن کی تُری اور سوئے میں غلط ملط کر دیا جائے تو چغتائی ناک بن جاتی ہے۔خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی کے مُو قلم کی ایجاد۔اسے دیکھ کر اللہ اور اس کے بندے، دونوں کی قدرت یاد آجاتی ہے۔

شروع شروع میں ناک کا مصرف سونگھنا تھا۔چنانچہ حیوانوں میں ابھی تک اس کا

ذوقِ صحیح موجود ہے۔ کتے اپنے روزمرّہ کی زندگی میں زیادہ تر قوتِ شامہ ہی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس لئے اُس نے جُوتے اور کپڑے سونگھنا متروک قرار دیا اور اپنے لئے عطریات بنا لئے۔ چنانچہ اونچی سوسائٹی میں لونڈر اور سینٹ کے انتخابات ہی سے انسان کے مذاق کی بلندی و پستی کا اندازہ کیا جاتا ہے

ناک سونگھنے ہی کے لئے تھی اور کسی حد تک اب بھی ہے۔ لیکن اب اس کے اور استعمال بھی نکل آئے ہیں۔ عورتیں ایک زمانہ سے اسے چھدوا رہی ہیں۔ شروع شروع میں دونوں طرف سوراخ کرانے اور بڑی بڑی نتھیں پہننے کا رواج تھا۔ آہستہ آہستہ ایک سوراخ جسے بے کہتے ہیں کم ہوا اور ساتھ ہی ساتھ نتھوں کا سائز بھی چھوٹا ہو گیا۔ اونچی سوسائٹی میں ان دنوں ناک چھدوانے کا رواج بہت معیوب ہے۔ ایک انگریزی اشتہار ملاحظہ ہو:۔

"ضرورت ہے ایک اُونچے گھرانے کی ناکتخدا تعلیم یافتہ خوش شکل لڑکی جس کی ناک چھدی ہوئی نہ ہو۔"

اونٹوں کی اُونچی نیچی سوسائٹی میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ چنانچہ ناک چھدوانے اور نکیل پہننے کا رواج اُن کے ہاں عام ہے۔

عورتوں کی ناک کے حسن کی افزائش کے لئے بےشمار زیور ایجاد ہوئے۔ جن میں نتھ، کیل، بلاک (یہ ناک کی درمیانی دیوار کو چھید کے پہنا جاتا ہے) اور لونگ مشہور ہیں۔

ایک "لونگ پہنی مٹیار" کے بارے میں پنجاب کے کسی دیہاتی کی یہ بولی بہت مشہور ہے

تیرے لونگ دا پیا لشکارا   تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے

تیری لونگ نے جب چمک پیدا کی تو ہل چلانے والوں نے اس خیال سے اپنے ہل روک لئے کہ بجلی چمکی ہے۔ ممکن ہے بارش ہونے لگے۔

بعض ناکوں کو زیور کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

ناک میں نیم کا فقط تنکا

شوخی چالاکی اقتضا سن کا

پچھلے پچاس ساٹھ برس سے ناک کا ایک اور بھی مصرف معلوم ہوا ہے۔ چنانچہ آنکھوں کی بینائی درست کرنے کیلئے جب عینک ایجاد ہوئی تو اسے ناک پر بٹھا دیا گیا۔ سیدھا راستہ بتانے میں تو عام طور پر اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "ناک کی سیدھ چلے جایئے"۔

پرائمری سکولوں میں جب کسی استاد کو اپنے شاگرد کے طمانچہ لگانا ہوتا ہے تو وہ سہولت کی خاطر اپنا ہاتھ گال پر اچھی طرح جمانے کے لئے اس کی ناک دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔ لیکن مغربی ممالک میں ہمارے پرائمری سکولوں کے استاد کی اس اپج سے ابھی تک استفادہ نہیں کیا گیا۔ ایران میں البتہ جب کسی معتوب کو محفل سے باہر نکالنا مقصود ہو تو بیک بینی و دو گوش باہر نکالا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں تو ناک کی قسمیں بیان کرنی ہیں۔

بڑی ناک، اونچی ناک، پھلواں ناک، چپٹی ناک، میٹھی ناک اور پھلکی سی ناک کا شمار

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں۔ خوبصورت ناکوں میں نہیں ہوتا۔ لیکن محاورے میں بڑی اور اُونچی ناک کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ چنانچہ جب کسی کے بارے میں کہا جائے کہ وہ بڑے نام والے، بڑی ناک، والے ہیں تو ہمارا سر ہماری ناک سمیت احترام سے جھک جائے گا۔

بڑی اور اُونچی ناک حسن کی علامت ہو نہ ہو۔ عزت کی نشانی ضرور ہے۔ چنانچہ ایسی ناک پر مکھی بالکل نہیں بیٹھنے دی جاتی۔ اگر آپ کو کوئی ایسی ناک نظر آجائے جس پہ مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں تو آپ کو فوراً سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا مالک ذلیل و خوار آدمی ہے۔

ناکوں کی مختلف شکل و صورت کے متعلق پروفیسر ٹامسن اور مسٹر بکسٹن ہی ہماری رہبری کرتے ہیں۔ ان حضرات کی تحقیق و تدقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اس عضو پر موسم خاص طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی تشکیل میں چنانچہ یہی کارفرما ہیں۔ پروفیسر ٹامسن کے نظریئے کے مطابق گرم اور مرطوب آب و ہوا میں رہنے والوں کی ناک اُونچی ہوتی ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب اپنی تحقیق میں اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکے کہ ایسی آب و ہوا میں رہنے والے باوقار اور باعزت لوگ ہوتے ہیں۔

تاریخی ناکوں میں دو ناکیں بہت مشہور ہیں۔ ایک ناک تو وادی نیل کی معشوقہ قلوپطرہ کی تھی جس کے متعلق یہ دیر تک سوچا جاتا رہا ہے کہ اگر یہ ایک انچ کا آٹھواں حصہ بڑی ہوتی۔ تو عیسائیوں کی تاریخ تمدن بالکل مختلف ہوتی۔ قلوپطرہ کی اس تاریخی ناک کو حیرت ناک کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے تصور ہی سے لوگ ورطۂ حیرت میں غرق ہو جاتے

ہیں کہ ایک عورت کی ناک قوموں کی قسمت میں نکیل ڈالنے کا باعث کیونکر ہو سکتی ہے؟

دوسری ناک کو ہولناک کہتے ہیں۔ یہ بھی مصر ہی کی پیداوار ہے اور ابوالہول کے سنگین چہرے پر حضرت مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے کی بیٹھی ہوئی ہے۔

ان دو ناکوں کے علاوہ اور کوئی تاریخی ناک نہیں جس کا ہمیں علم ہو۔ عبرتناک البتہ ہم نے اکثر آوارہ اور بدچلن عورت کے چہرے پر دیکھی ہے۔ غیرت مند شوہر جب بھی اپنی بدچلن بیوی کو سزا دیتا ہے۔ ایسی عبرتناک معرض وجود میں آجاتی ہے۔ ایسی ناکوں کو جنہیں سوسائٹی میں ہر قدم پر کٹ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے، خطرناک کہلاتی ہیں۔

تشویشناک بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہے، لیکن جب نظر آجائے تو بعض دیکھنے والوں کی ناک کو تشویش پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر کہیں ہے تو ممکن ہے کہ ہونٹوں کی جنبش میں وہ خود ہی غائب ہو جائے۔ سُنکتے وقت جو ناک بہت شور مچائے وہ شورش ناک کے نام سے مشہور ہو جاتی ہے۔

نم ناک سے تو ہر ایک کو واسطہ پڑ جاتا ہے۔ نزلے اور زکام کی حالت میں اچھی اچھی سے طربناک، نم ناک بن جاتی ہے کہ دیکھنے والوں کی اپنی ناک مارے وحشت کے وحشت ناک ہو جاتی ہے۔

نئی نئی چھدی ہوئی ناک جس کی بے میں سوجن ہو دردناک کہلاتی ہے اور رحم ناک اس ناک کو کہتے ہیں جو سردیوں میں اکیلی پڑی ٹھٹھر رہی ہو جسم کے دوسرے اعضا تو گرم گرم کپڑوں میں ڈھکے ہوں اور یہ بیچاری تن تنہا سردی کے طمانچے کھا رہی ہو۔ ایسی

ناک جسے دیکھ کر دل میں افسوس پیدا ہو کہ ہائے انسان کے چہرے پر ایسی ناک بھی ہو سکتی ہے۔ افسوس ناک کہلاتی ہے۔ افسوس کی حد سے گزر جائے تو اندوہ ناک ہو جاتی ہے لیکن وہ خوبصورت ناک جو غضب ڈھا رہی ہو غضبناک کہلائے گی۔

فریب ناک عام طور پر طوائفوں کے چہرے پر پائی جاتی ہے۔ نتھنی کتنی دفعہ اتر چکی ہے۔ اس کا پتا تماش بین حضرات کو ان ناکوں سے کبھی نہیں چلتا۔ فریب کھا کر ان تماش بین حضرات میں سے اکثر کی ناک خشمناک ہو جاتی ہو گی۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے

مشتے کہ بعد از جنگ یاد می آید بر بینی خود باید زد۔

شرم سے عام طور پر انسان کی پیشانی عرق آلود ہوتی ہے۔ لیکن اگر شرم کا احساس بہت ہی شدید ہو تو ناک پر بھی پسینے کی بوندیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ ایسی ناک کو شرمناک کہا جائے گا اور وہ ناک جس کے تصوّر ہی سے خوف و ہراس طاری ہو جائے۔ خوفناک کہلائے جانے کی مستحق ہے۔

چکنی اور چمکیلی ناک کا شمار خاندانی ناکوں میں نہیں ہوتا۔ انگریزی سوسائٹی میں تو خاص طور پر ایسی ناک بہت ہی بُری قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ اس کی چکناہٹ اور چمک دُور کرنے کے لئے آئے دن دوائیں ایجاد ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے یہاں ایسی ناک کو تابناک کہتے ہیں۔ اس لئے کہ دوسری غیر چمکیلی ناکیں ان کی تاب نہیں لاسکتیں۔

ایک ناک جو حال ہی میں مولانا چراغ حسن حسرت نے دریافت کی ہے خضر ناک ہے۔ خواجہ خضر کی بند ناک سے جس کے نتھنوں میں پانی گھستا ہی نہیں۔ اس ناک کا کوئی تعلق

نہیں۔ یہ ناک صرف ملک خضر حیات خاں ٹوانہ سابق وزیر اعظم پنجاب کے چہرے پر ہے سیاست کے اکھاڑے میں بہت بری طرح مکے اور گھونسے کھانے کے بعد آج کل یہ لندن میں اونچی ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن پروفیسر ٹامسن اور مسٹر بکٹسن کی تحقیق کے مطابق سرد ملکوں میں ناک کے پنپنے کے کچھ زیادہ امکانات نہیں ہیں۔

برقیہ ۔ یہ مضمون اشاعت کے لئے پریس میں جا رہا تھا کہ لندن سے ملک خضر حیات کا برقیہ موصول ہوا۔ آپ لکھتے ہیں مولانا چراغ حسن حسرت کی ناک کو ہرگز فراموش نہ کیا جائے۔ کیونکہ ایسی حسرتناک و الٹیر کے بعد صرف انہی کے حصے میں آئی ہے ؎

حسرت اُن ناکوں پہ ہے جو بِن کٹے مرجھا گئیں

کھانسی پر

ہمارے یہاں جب کوئی طبیب اپنا کام شروع کرتا ہے تو بسم اللہ کر کے وہ سب سے پہلے مردوں کی قوتِ مردمی کے لئے نسخہ ایجاد کرتا ہے جس کو مجرّب ثابت کرنے کے واسطے وہ خدا اور اس کے رسولؐ کی قسمیں کھا کھا کر ساری عمر اشتہار دیتا رہتا ہے یورپ میں جب کوئی فرم دوا سازی کا کام شروع کرے گی تو وہ سب سے پہلے کھانسی کی تیر بہدف دوائی ایجاد کرے گی اور باپ بیٹے اور روح القدس کو حاضر ناظر جانے بغیر اس کے حیرت انگیز اثر کا اشتہار دیتی رہے گی۔

کھانسی کے لئے اب تک جتنی انگریزی دوائیاں ایجاد ہوئی ہیں اور کسی بیماری کے لئے نہیں ہوئیں۔ سُنا ہے کہ یہ مرض بہت پرانا ہے اور سب سے پہلے اماں حوّا کو ہوا تھا۔ تحقیق و تدقیق کرنے والے اس نظریئے کے جواز میں عورت کے ترقی پسند جبلّی میلان کو پیش کرتے ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ عورتیں مردوں کی بہ نسبت

کھٹی چیزیں زیادہ رغبت سے کھاتی ہیں۔ تجربے کے طور پر اگر آپ مردوں اور عورتوں کی ملی جلی محفل میں اپنی جیب سے املی کی پھلی نکالیں تو سب سے پہلے عورتوں کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔

اس مرض کا آغاز عورت سے ہوا تھا یا مرد سے۔ اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں کیونکہ یہ بیماری آج کل دنیا میں کافی مقبول ہے اور امکان یہی ہے کہ آنے والی نسلوں میں اس کی مقبولیت اور بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔ کھانسی سے شغف رکھنے والے ماہرین اعداد و شمار سے ثابت کر چکے ہیں کہ ہم پرانی نسل کے مقابلے میں زیادہ کھانستے کھنگارتے ہیں اور یہ بات بھی پایۂ تصدیق کو پہنچ چکی ہے کہ کھانسی صرف اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ اس کا علاج کیا جائے۔

کھانسی کے بے شمار علاج ہیں۔ طبیبوں کے لبوب ہیں۔ قرص ہیں، شربت ہیں معجونیں ہیں، دھونیاں ہیں، جوشاندے ہیں، فقیروں اور درویشوں کی چٹکیاں، تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے ہیں۔ ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک کی ہزارہا دوائیں ہیں اور اگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہے تو پھانسی موجود ہے، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

عرصہ ہوا۔ ایک شخص نے جو پھانسی کے پھندے سے بچ نکلا تھا۔ اپنے تجربے کے پیش نظر یہ ضرب المثل ایجاد کی تھی کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ حال ہی میں ایک اور شخص نے پھانسی کے پھندے سے بچ کر پریس کانفرنس میں اپنا بیان دیا ہے کہ

کھانسی پھانسی پر بھی آجاتی ہے۔ ثابت ہؤا کہ یہ بہت بری بلا ہے۔ اس لئے خداوند کریم کو چاہئے کہ وہ سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین ثم آمین۔

لیکن جو شخص اس مرض میں لاحق ہو جائے۔ اس کو سب سے پہلے اس کے رنگ و نسل پر غور کرنا چاہئے۔ کیونکہ معلوم ہؤا ہے کہ اس کی ایک نہایت ہی ادنیٰ ذات جسے کالی کھانسی کہتے ہیں۔ بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں گوری کھانسی کو لیجئے۔ بہت ہی بے ضرر قسم کی ہوتی ہے۔ جس طرح سفید فام انگریز۔ جس کو لاحق ہوتی ہے اسے زیادہ تکلیف نہیں دیتی۔ اس کا مریض ہولے ہولے کھانستا ہے اور اسی طرح لگے بندھے سبتک کے اندر کھانستا کھانستا جان بحق تسلیم ہو جاتا ہے اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیتا ہے ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اب کالی کھانسی کو لیجئے جسے حقارت کے طور پر کتا کھانسی بھی کہتے ہیں۔ اس کا مریض دن کو تو خاموش رہتا ہے۔ لیکن رات کو چونکہ دوسروں کو آرام کی نیند سونا ہوتا ہے۔ بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن ہندوستانی اور پاکستانی گائکوں اور موسیقاروں نے بیک تان فیصلہ دیا ہے کہ کالی کھانسی اور کتے کی عف عف صوتی اعتبار سے کوئی مماثلت نہیں رکھتی۔ کالی کھانسی کھانسنے والا دوسرے کالے سے شروع کرتا ہے اور کتا چوتھے کالے سے۔ کتوں نے فی الحال اس معاملے میں اپنی رائے کسی موزوں وقت کے لئے محفوظ رکھ چھوڑی ہے۔ لیکن کانوں میں

اتنی بھنک ضرور پڑی ہے کہ وہ اپنی بدترین قسم کی کھانسی کا نام انسانوں کی کھانسی رکھنے کا ریزولیوشن پاس کرنے والے ہیں۔

انسان رنگ و نسل کی تمیز حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے جسمانی امراض میں رنگوں کی تمیز بدستور موجود ہے۔ کالا آزار کو لیجئے۔ یرقان کو لیجئے۔ موخر الذکر کی بیماری بھی زرد رنگ ہونے کی وجہ سے گھٹیا قسم کی بیماریوں میں شمار ہوتی ہے۔ کالی کھانسی کا تو خیر کھانسیوں میں وہی درجہ ہوتا ہے جو ہندوؤں میں اچھوت کا ہوتا ہے۔ اسے کہتے تو چھوت کی بیماری ہیں۔ لیکن اس سے سلوک وہی روا رکھا جاتا ہے جو اچھوتوں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ چنانچہ کالی کھانسی کھانسنے والے انسانوں سے دوسرے رنگوں کی کھانسی کھانسنے والے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ اور ان سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کالی کھانسی چونکہ نیچ ذات ہے۔ اس لئے عام طور پر اس کا حملہ کمسن بچوں پر ہوتا ہے۔ بے چارے ہفتوں بستر پر ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہتے ہیں۔ کھانس کھانس کر ہلکان ہو جاتے ہیں۔ غوطے پر غوطے آتے ہیں۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جاتا ہے۔ مگر یہ کم بخت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بچے اس کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔ اگر بچہ کسی بڑے آدمی کا ہوتا ہے تو اخباروں میں مرض کے رنگ کی مناسبت سے سیاہ چوکھٹے کے اندر "حادثہ جانکاہ" کے عنوان سے اُس کی موت کا اعلان چھپ جاتا ہے اور یہ شعر ساتھ لکھ دیا جاتا ہے

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

کالی کھانسی کی ابتدا افریقہ کے ایک حبشی نے کی تھی مگر حبشی نہیں مانتے اس لئے کہ یہ دریافت سفید نسل کے ایک آدمی سے منسوب ہے۔

کھانسی کی بے شمار قسمیں ہیں۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ اسی طرح وقت وقت کی کھانسی ہوتی ہے۔ لیکن بے وقت کی کھانسی بہت ہی بے ڈھب مانی گئی ہے۔ سب آدمی سو رہے ہیں۔ چاروں طرف خاموشی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ الماری کھول کر اس میں سے کچھ روپیہ یا چند زیور نکال لیں۔ آپ کا حلق آپ کی نیت کی طرح بالکل صاف ہے۔ خراش کا نام و نشان نہیں پھیپھڑے بھی ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ گرد و غبار کا بھی کوئی امکان نہیں۔ لیکن دفعتہً آپ کے گلے میں گدگدی شروع ہو جائے گی۔ آپ لاکھ دبانے کی کوشش کریں لیکن یہ بن بلائی کھانسی آ کے رہے گی۔

حلق اچھا بھلا صاف ہوگا۔ نرخرے میں کسی قسم کی آلائش نہیں ہوگی لیکن جب آپ تقریر کرنے کے لئے اُٹھیں گے — معزز حضرات — کھوں کھوں — معزز حضرات — کھوں کھوں کھوں — معزز حضرات کھوں کھوں کھوں۔

ایسے اوقات میں ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک اور یونانی طریقۂ علاج کے تمام ماہرین نے متفقہ طور پر یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ تقریر کرنے والا اگر معزز حضرات کے

آوازوں سے جانبر ہو جائے تو خودکشی کرے

ایک کھانسی کا ظہور عین وقتِ نماز ہوتا ہے۔ محمود و ایاز صف باندھے کھڑے ہیں۔ دھیان اللہ کی طرف ہے۔ ایک دم کچھ ہوگا اور محمود کے حلق سے کھوں نکل جائے گی۔ ایاز جو کہ چوتھی صف میں آخری سرے پر سر نیہوڑائے کھڑا ہے۔ اپنے حلق میں ٹیلی پیتھی محسوس کرے گا اور غیر ارادی طور پر اس کے حلق سے بھی ایک عدد کھوں باہر سرک جائے گی اور تھوڑے ہی عرصے میں "شغلِ عبادت" "شغل کھوں کھاں" میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی چونکہ نہیں تھا۔ اس لئے لازماً خداوندِ حکیم کے پاس ہوگا۔

ایک کھانسی حقے کی کھانسی ہے۔ اس کو کھانسنے والے حضرات منہ اندھیرے اٹھ کر خدا کا نام لیتے ہیں نہ رسول کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنا حقہ تازہ کرتے ہیں اور چلم بھروا کر اولیں کش لیتے ہی کھانسنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کھانستے کھانستے منہ سرخ ہو جائے گا گلے کی رگیں ابھر آئیں گی۔ چھاتی دھونکنی کی طرح چلنے لگے گی مگر وہ حقے کے بقے کھینچتے جائیں گے۔ ان حضرات کا بیان ہے کہ آدمی جتنا زیادہ کھانسے اتنا ہی زیادہ ثواب ہوتا ہے۔

حقہ کھانسی کھانسنے والے جب بڈھے ہو جاتے ہیں تو ایک ہی کش ان پر چودہ طبق روشن کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ پہلا کش لے کر یہ بزرگ ایک دفعہ کھوں کرتے ہی مراقبے میں چلے جاتے ہیں اور تقریباً ایک گھنٹے بعد اوپر کا سانس اوپر نیچے

کلیجے رکھنے کے بعد دوسری کھوں کرنے کے لئے ہوش میں آتے ہیں۔

کھانسی برائے کھانسی ہے یا کھانسی برائے زندگی ہے۔ اس پر ایک زمانہ سے بحث ہو رہی ہے۔ دو سکول بن گئے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ انسان کو صرف کھانسنے ہی کے لئے کھانسنا چاہئے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں انسان کو اپنی زندگی کے لئے کھانسنا کھنکارنا چاہئے ہو خر الذکر سکول کے پیرو چنانچہ بسا اوقات لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے کھانسی ہی سے کام لیتے ہیں۔ دوست جا رہا ہے حلق میں تھوڑی سی خرخراہٹ پیدا کی "کھوں کھوں — کہئے جناب کیا حال ہے؟"

پاخانے میں محو اجابت ہیں۔ دروازے میں کنڈی نہیں۔ ذرا آہٹ ہوئی تو کھانس دیا مطلب یہ کہ نو ویکینسی!

دور کوٹھے پر کھڑی ایک عورت کھڑی اپنے بال سکھا رہی ہے۔ بیٹھے آپ کی طرف ہے جی چاہتا ہے کہ اس کی شکل دیکھی جائے۔ گلے میں ذرا سرسراہٹ پیدا کی اور ہلکی سی کھوں ہوا میں پھینک دی۔ یوں چٹکی بجاتے میں مطلب حل ہو جاتا ہے۔

آپ کے دوست کے ساتھ ایک عورت جا رہی ہے معلوم نہیں اس کی بہن ہے یا ماں لیکن چونکہ آپ کو اس پر شبہ ہوتا ہے کہ وہ ایک عورت کے ساتھ جانے کی عیاشی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس لئے آپ بلا تکلف ایک یا دو مرتبہ کھوں کر کے اپنا فرضِ منصبی ادا کر سکتے ہیں۔

ایک کھانسی خالصتہً گویوں کی کھانسی ہے جسے فیشن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے محفل جمی ہوئی ہے۔ آپ ہارمونیم کی پیٹی اپنے گانے والے دوست کی طرف بڑھاتے ہیں اور کچھ سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ وہ فوراً اپنا ہاتھ گلے کی طرف لے جائے گا اور اسے دبا کر آپ سے کہے گا "مجھے کئی دنوں سے

کھانسی کی شکایت ہے۔ کھوں کھوں۔ یہ لیا۔"

سُنا ہے کہ میاں تان سین اور بیجو باورے نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی تھی کہ فرمائش پر فوراً ہی گانا شروع کر دینا ہلکا پن ہے۔ اس لئے کھانسی اور نزلہ زکام کی شکایت کا بہانہ کرنا لازم ہے اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر سُر غلط لگ جائے تو فوراً کھانسی کو مجرم قرار دیا جا سکتا ہے عادت پک کر طبیعت بن جاتی ہے۔ چنانچہ گانے والے جب ریاض بھی شروع کرتے ہیں تو استاد کا نام لے کر ایک دو بار کھانس کھنکار لیتے ہیں۔

بعض اوقات کچھ کھاتے یا پیتے ہوئے ایک دم ایسی کھانسی اُٹھتی ہے کہ لقمہ اور گھونٹ پھوں کر کے ناک کان اور منہ کے رستے باہر نکل آتے ہیں اور پھر کچھ اس قسم کی کھوں کھاں شروع ہوتی ہے کہ آدمی سمجھتا ہے۔ بس کام تمام ہوا۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر کام تمام نہیں ہوتا۔ خاص طور پر کیا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق خواص عوام سے بہتر جانتے ہیں۔ کھانسی کے اس ناگہانی حملے کو اردو کے معلّی ایس" اُتھو" کہتے ہیں۔

کھانسنے کھنکارنے اور اس عمل سے بلوئے ہوئے بلغم کے ذریعے سے فرشوں اور دیواروں پر پلستر کرنے اور بیل بوٹے بنانے کی صنعت کسی زمانے میں ہمارے یہاں معراج پر تھی لیکن انگریزوں کی ایک سو سالہ حکومت میں اس سے اچھا سلوک نہ ہوا۔ پر اب کہ لاتعداد قربانیاں دینے کے بعد خدا کے فضل و کرم سے دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ ہمیں اس صحت مند صنعت کو بامِ رفعت تک پہنچانے کے لئے مقدور بھر کوشش کرنی چاہیئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے

معزز خواتین اور معزز حضرات۔ ذلیل عورتو اور ذلیل مردو — با ادب' با ملاحظہ ہوشیار!! — آپ سب کو بروقت آگاہ کیا جاتا ہے کہ ایک سوال پیدا ہو رہا ہے۔

ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک اتنے ہی سوال پیدا ہو چکے ہیں جتنے کہ آسمان میں تارے ہیں۔ لیکن پھر بھی آئے دن پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی اٹھ کر یا بیٹھ کر یہ نہیں کہتا کہ اب مزید سوال پیدا نہیں ہونے چاہئیں۔

آبادی گھٹانے کے لئے اللہ تبارک تعالیٰ بھونچال پیدا کرتا ہے۔ لڑائیاں پیدا کرتا ہے۔ قحط پیدا کرتا ہے۔ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان پیدا کرتا ہے۔ برتھ کنٹرول کے نت نئے طریقے انسانوں کو سُجھاتا ہے۔ مگر وہ سوالوں کی جمع در جمع اور ضرب در ضرب کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

سوال ہر جگہ پیدا ہوتا ہے اور ہر مقام پر پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے خاص

موسم کی، خاص مٹی کی، خاص پانی کی، کھاد کی، بیل کی، ٹریکٹر کی، کوئی ضرورت نہیں، بچہ نو مہینے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ لیکن سوال نطفہ قرار پاتے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ اسکے دایہ گیری کی حاجت نہیں۔ میٹرنٹی ہوم کی ضرورت نہیں۔ کلوروفارم درکار نہیں آؤ دیکھتا ہے نہ تاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

عدالت میں مجسٹریٹ صاحب حقہ پی رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہی کیس کا دیوان مطالعہ کر رہے ہیں۔ کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مجرم پیش ہوتا ہے وہ مجسٹریٹ صاحب کو سلام نہیں کرتا ــ فوراً توہینِ عدالت کا سوال پیدا ہو جائے گا۔

آپ کو کوئی کام نہیں مل رہا۔ دو برس تک دربدر مارے مارے پھرنے اور فاقے کھینچنے کے بعد آپ نے تنگ آکر خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر شومئی قسمت سے ناکام رہے ــ قانونی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپکو کیوں اپنی جان لینے کے جرم میں سزا نہ دی جائے۔

میونسپلٹی نے دس میل لمبی ٹھنڈی سڑک بنائی اور صفائی کے پیشِ نظر ان دس میلوں میں کہیں بھی پبلک یورینل نہ بنایا۔ ایک روز مثانے نے آپ کو مجبور کیا۔ اسے ہلکا کرنے کے لئے آپ زیرِ دیوار بیٹھے ہی تھے کہ پولیس کے سپاہی نے دیکھ لیا ــ ناشائستہ حرکت کا سوال پیدا ہو گیا۔

آپ مقامی مہاجر ہیں۔ ایک پریس آپ کا راولپنڈی میں چل رہا ہے۔ دوسرا پشاور میں۔ رہائش آپ کی لاہور میں ہے۔ آپ درخواست کرتے ہیں اور ایک پریس لاہور میں اپنے نام الاٹ کرا لیتے ہیں۔ کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

آپ مہاجر ہیں۔ جہاں سے آئے ہیں۔ وہاں آپ ایک بہت بڑے پریس کے مالک تھے۔ لاہور میں آپ کو کوئی پریس نہیں ملتا۔ تنگ آکر آپ شکایت کرتے ہیں کہ فلاں مقامی مہاجر کو پریس الاٹ نہیں کرنا چاہئیے تھا ـــ سوال پیدا ہو جائے گا۔ کہ مقامی مہاجر آپ سے زیادہ اہل ہے۔ اس لئے کہ اسے دو پریس چلانے کا محاورہ ہے۔

آپ کے گھر میں ایک مہینے کے اندر اندر چھ مرتبہ چوری ہوتی ہے۔ آپ نے اس خیال سے پولیس کو اطلاع نہیں دی تھی کہ اُسے ناحق تکلیف ہو گی مگر پولیس کو پتہ چل جاتا ہے ـــ یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ آپ نے اپنے اہم ترین فرض میں کوتاہی کیوں برتی؟

سوال بے شمار پیدا ہو چکے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ پچھلی صدی میں سب سے خوفناک سوال جو آئے دن پیدا ہوتا تھا۔ حضور ملک معظم کی حکومت کا تختہ الٹنے کا تھا۔ چنانچہ ان سو برسوں کی تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو قریب قریب ہر صفحے پر اس سوال کے پھندے میں آپ کو متعدد آدمیوں کی گردنیں پھنسی ہوئی دکھائی دیں گی۔

کسی نے ہولے سے کہہ دیا۔ "ہماری جہالت ہماری غربت، ہماری غلاظت کا باعث صرف غلامی ہے"۔ فوراً حضور ملک معظم کی سلطنت کا تختہ اُلٹنے کا سوال پیدا ہوا اور اسے تختۂ دار تک لے گیا۔

امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں لوگوں نے مل جُل کر آزادی طلب کرنے کے لئے جلسہ کیا۔ حضور ملک معظم کی سلطنت کا تختہ اُلٹنے کا سوال پیدا ہوا اور دو ہزار دو کی ہلاکت کا باعث ہو گیا۔

سوال عام طور پر خطرناک ہوتے ہیں۔ حاکموں کے دماغ میں پیدا ہوں وُہ بھی، محکوموں کے دماغ میں پیدا ہوں وُہ بھی۔ حکومت کے دماغ میں عام طور پر صرف ایک ہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بے شمار قسمیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن سوال وہی رہتا ہے کہ ایسے کون سے ایکٹ استعمال کئے جائیں۔ جن کی رو سے عوام کے ذہن میں حکومت کے متعلق پیدا شدہ سوال دب جائیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے کیا عوام کے اذہان میں حکومت کے متعلق پیدا شدہ سوال دب جاتے ہیں؟ — تجربات شاہد ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ ایکٹ اور قوانین ایسے نتائج پیدا کرنے میں انجام کار ہمیشہ ناکام رہے۔ کیوں؟ دیکھئے پھر سوال پیدا ہو گیا۔

ضروری نہیں کہ ہر سوال کا جواب بھی ہو۔ سوال تو یہ ہے کہ مصلحت کیا ہے؟ — اگر مصلحت خاموشی میں ہے تو جو آدمی ذہین ہیں اور جنہیں عرفِ عام میں سیاستدان کہا جاتا ہے۔ یقیناً خاموشی ہی اختیار کریں گے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کیا یہ خاموشی دوسروں کے ذہن میں تکلم کی صورت اختیار نہیں کرے گی؟ — لیکن سوال یہ ہے کہ ان آدمیوں کا خاتمہ ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ جن کے زرخیز دماغوں میں سیاستدانوں کی خاموشی تکلم کی صورت اختیار کر لیتی ہے — مگر ایک سوال پھر پیدا ہو جائے گا۔ کہ ایسے آدمیوں کا خاتمہ جسے انگریزی کے عرفِ عام میں "پرج" یعنی 'جلاب' کہا جاتا ہے کیا دوسرے لوگوں کے اذہان پر بھی قابض ہو جائے گا اور ان میں اس جلاب کا کوئی بھی

ردِّ عمل پیدا نہیں ہونے دے گا۔

ایک انسان یا ایک جماعت ایک قوم پر یا بہت سی قوموں پر حکومت کرتی ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ محکوموں کے دماغ میں سوال کیوں پیدا ہو جاتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ بس اس فردِ واحد یا اس جماعت کا جی چاہتا ہے کہ حکومت کرے اور حکومت کرنے کے لئے قواعد و ضوابط بھی کون سے مقرر ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دماغ میں جن پر صرف ان کی بہتری کے لئے حکومت کی جاتی ہے۔ ایسے سوال کیوں پیدا ہوتے ہیں جن سے ان کی سودمند غلامی میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔

فرانسیسی مفکّر جے جے روسو کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ انسان جب آزاد پیدا ہوا ہے تو اسے کیوں زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے ــــ لیکن اس سوال کا کیا حشر ہوا؟ زنجیریں کاٹتے کاٹتے کئی انسان کٹ گئے ــــ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایسا انقلاب جائز ہے؟ ــــ روس میں کیا ہوا؟ ــــ صدیوں کے غلام آزادی کا سوال لے کر اٹھے اور نتیجہ کیا ہوا ــــ ان کے مطلق العنان بادشاہ زار کو ایک عرصے تک سائبیریا کی یخ بستہ فضاؤں میں مزدوروں کا سا کام کرنا پڑا ــــ آخر میں انقلابیوں نے خدا کے اس سائے کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ زار کی یہ حالتِ زار دیکھ کر شاید ہی کوئی ایسا بادشاہ ہو جس کی آنکھوں میں آنسو نہ آ جائیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رعایا کو کیا حق ہے کہ وہ اپنے بادشاہ سلامت کو، عالم پناہ کو محض ایک چھوٹا سا سوال پیدا ہونے پر قربان کر دے۔ لیکن کیا کیا جائے۔

سوال چھوٹے ہوں یا بڑے، موٹے ہوں یا پتلے، پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔ بے سوچے سمجھے، انجام کا خیال کئے بغیر، نفع ضرر سے بے پروا، بس پیدا ہو جاتے ہیں۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ جو سوال دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی کاٹ دماغ ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ سوال جو پیٹ کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی کاٹ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کے پیٹ میں بھوک کا سوال پیدا ہوتا ہے اگر اس کے جواب میں آپ ہمدردی کا اظہار کریں۔ آنے والے مسرت بھرے دور کا وعدہ کریں۔ جنت کی جھلک دکھائیں۔ جہاں انگور کے دانے اپنے آپ جھک کر منہ میں اپنا رس چوایا کریں گے تو ظاہر ہے۔ آپ کی سعی بار آور ثابت نہیں ہوگی کیونکہ پیٹ کا سوال فوری جواب مانگتا ہے۔ اسے روٹی کی ضرورت ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے۔ پھر کیوں پیٹ کے سوال کا حل روٹی کے بجائے سوٹی سے کیا جاتا ہے؟.... لیکن پھر یہ سوال بھی تو پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو دنیا میں ہر جگہ دھاندلی مچ جائے گی۔

بعض سوال تو اتنے بیڈھب ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے بینڈے پن سے پیدا ہوتے ہیں کہ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے۔

چند روز ہوئے میں ایک سیلون میں شیو کرا رہا تھا۔ داڑھی مونڈتے مونڈتے اچانک باربر کے دماغ میں ایک سوال پیدا ہوا۔ "کیوں صاحب یہ تو بتائیے گاندھی جی خود شیو کرتے تھے یا کسی سے کراتے تھے؟" ___ بتائیے میں کیا جواب دیتا

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا میرا اعتراض بالکل فضول نہ ہوتا۔ اگر میں اس سے کہتا۔ "یہ کیا اوٹ پٹانگ سوال تمہارے دماغ میں پیدا ہوا ہے"؟

آدمی نائی ہو یا موچی، چمار ہو یا بھنگی، لکھ پتی ہو یا کنگال۔ اس کے دماغ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوں گے اور اب تک ایسا کوئی طریقہ معلوم نہیں ہوا۔ جس کے ذریعے سے ان کا برتھ کنٹرول ہو سکے۔

پرسوں بیٹھے بیٹھے نہیں کھڑے کھڑے میرے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا۔ "عدم جب وجود میں آیا تو کیا عدم کو کچھ تسکین ہوئی تھی"؟

بڑوں کو چھوڑیئے، بعض اوقات چھوٹے چھوٹے بچوں کے دماغ میں بھی ایسے عجیب و غریب سوال پیدا ہوتے ہیں کہ جواب دینے والا بغلیں جھانکنے لگتا ہے مثال کے طور پر "امی میں کہاں سے آیا ہوں"۔ یا۔ "ابا کیا کبوتریاں بھی کبوتروں سے کمر دبواتی ہیں"۔

دو چھوٹے بچے تھے۔ جب انہوں نے گھر کے ایک بند کمرے کی جھری میں سے اندر جھانک کر دیکھا تو ان کے دماغ میں یہ گستاخ سوال پیدا ہوا "ہمیں تو کہتے ہیں کہ ننگے پاؤں نہ پھرو اور....."

سوال جاہل سے جاہل دماغوں میں بھی پیدا ہوتے ہیں۔ چند روز ہوئے میکلوڈ روڈ پر ایک کباب بیچنے والے کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا۔ "کیوں صاحب سنا ہے حضرت عمرؓ جو مسلمانوں کے خلیفہ تھے مسجد میں جھاڑو دیا کرتے تھے۔ ہمارے قائداعظم

بھی کیا مسجد میں جھاڑو دیتے ہیں"؟ اسی طرح ایک پنواڑی کے دماغ میں کچھ اسی قسم کا سوال پیدا ہوا — "میں قائدِ اعظم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسلامی حکومت کیا اسی کا نام ہے کہ میرے تن پر تو چیتھڑے لٹکتے ہیں۔ لیکن تم نئی سے نئی اچکن پہنتے ہو" — ظاہر ہے کہ یہ سوال کفر کے برابر ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ سوال ہیں کفر و الحاد کا خیال کئے بغیر پیدا ہو جاتے ہیں"۔

بعض اوقات ایک ہی سوال ایک ہی وقت میں ہزارہا لوگوں کے دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آج کل لاکھوں کی زبان پر یہ سوال ہے کہ یہ وزارت جو مغربی پنجاب پر حکومت کرتی ہے۔ وزارت ہے یا شرارت؟......

جو عرفِ عام میں جاہل ہیں۔ ان کے دماغ میں بھی یہی سوال اس شکل میں پیدا ہوتا ہے "غریبوں کی خبر لینے والے کہاں ہیں" — اب ان جاہلوں سے کون کہے کہ وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی آپ اپنی خبر نہیں آتی۔

اور سنئے۔ اسی قسم کے ایک جاہل آدمی کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا۔

"نواب دولتانہ — نواب ممدوٹ۔ یہ کیا نوابی ٹھاٹ ہے"؟

ایک بچہ چند روز گذرے اپنے باپ سے پوچھ رہا تھا "ابا جی ممدوٹ اور اخروٹ میں کیا فرق ہوتا ہے"؟

سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا ایسے بدتمیز بچوں کا گلا نہیں گھونٹ دینا چاہئے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایسا کرنے پر کوئی اور سوال پیدا ہو جائے گا۔

پاکستان میں آج کل مندرجہ ذیل سوالوں کی پیدائش عام ہے۔

۱۔ عورت کو پردہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

۲۔ اگر پردہ ضروری ہے تو کیا نرسوں کو برقعہ پہن کر اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں۔

۳۔ عورت کو دو چوٹیاں کرنی چاہئیں یا صرف ایک؟

۴۔ کیا عورت کا زمین پر زور سے پاؤں مار کر چلنا جائز ہے؟

۵۔ عورت کو شلوار پہن کر گھڑسواری کرنی چاہئے یا ساڑھی پہن کر۔

عورت ہی کے سلسلے میں ایک اور سوال پیدا ہوا تھا ——————

— جب ایک داڑھی والی عورت نے ایک مولوی سے پوچھا تھا "میرے متعلق کیا احکام ہیں۔ کیا مجھے داڑھی رکھنی چاہئے۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو فرمایا جائے کتنی لمبی — اور مونچھوں کے متعلق کیا حکم ہے۔ لبیں کتروانی چاہئیں یا نہیں؟"

ایک سوال جو بار بار پیدا ہو کر ہمارے قائدین کو ستا رہا ہے۔ ان پچاس ہزار عورتوں کا ہے جو اُس پار رہ گئی ہیں اور دوسروں کے استعمال میں آ رہی ہیں۔ نو مہینے سے کچھ اوپر ہو چکے ہیں انہیں اس کا حل سوچتے ہوئے اور اب مصیبت یہ ہے کہ ان پچاس ہزار عورتوں کے سوال کے ساتھ ہی پچاس ہزار اور چھوٹے چھوٹے سوال پیدا ہو جائیں گے اور بہت ممکن ہے۔ دس بیس ہزار ہو بھی چکے ہوں — لعنت بھیجئے ان پر — یہاں ایک سوال پیدا ہو رہا تھا۔

معزز خواتین و معزز حضرات، ذلیل عورتو، ذلیل مردو — جو سوال پیدا ہو رہا تھا۔ افسوس ہے کہ پیدا ہوتے ہی مر گیا — سوال مر گیا — سوال زندہ باد —!!

کچھ ناموں کے بارے میں

بچہ پیدا ہو تو سب سے پہلے یہ استفسار کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ کس پر گیا ہے۔ ننھیال پر یا ددھیال پر۔ اس کے خدوخال چچیرے ہیں، ممیرے ہیں یا خلیرے۔ کوئی ناک بالکل باپ کی بتائے گا اور کوئی ہو بہو ماں کی اور کوئی اسے خالہ کے بھائی کے باپ کے چچا کے دادا کی ناک سے جا ملائے گا۔

بعض اوقات ایسا منفرد بچہ بھی پیدا ہوتا ہے جس کے ناک نقشے کا سُراغ اس کے آباؤ اجداد کے شجرہ سراپا میں ڈھونڈنے پر بھی کہیں نہیں ملتا۔ لیکن بوڑھی عورتیں بھی کچھ ایسی کوملیس ہوتی ہیں کہ وہ یہ امر یکا بھی دریافت کر لیتی ہیں اور اس منفرد بچے کے ماں باپ کی اُلجھن دُور کر دیتی ہیں۔

بچہ تو خیر مقررّہ وقت کے بعد پیدا ہو جاتا ہے کہ اُسے پیدا ہونا ہی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ناک نقشہ ملانے کے علاوہ اس کی پیدائش پر اور بھی کئی مسائل

پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں ان تمام پیچیدہ مسائل کا ذکر نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ بچے کا نام رکھنے کا اکیلا مسئلہ ہی اُس صحبت کے لئے کافی ہے۔

بچہ یا بچی جو بھی آپ کی قسمت میں تھی پیدا ہو گئی۔ اُس کا ناک نقشہ بھی کھینچ گھسیٹ کر کسی سے مل گیا۔ لیکن ابھی چھٹی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ اس دُنیا میں نئے نئے آنے والے یا نئی نئی آنے والی کا نام کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہئے۔ اگر آپ ڈکٹیٹر قسم کے انسان ہیں اور اپنے عزیز و اقارب کے جذبات و احساسات کو بالکل خطرے میں لانے والے نہیں تو آپ اپنے تخلیق کردہ گوشت پوست کے لوتھڑے کا نام یوں چٹکیوں میں مقرر کر دیں گے اور آرام کی نیند سوئیں گے۔ لیکن وہ ماں باپ جو ذرا دنیادار قسم کے ہیں اُن کے لئے اپنے ننھے یا اپنی ننھی کا نام مقرر کرنا مستقل خلجان بن جائے گا۔

خالو جان کا ڈھاکہ سے خط آئے گا۔ لکھا ہو گا میں نے ننھے کے لئے خدا اس کی عمر دراز کرے۔ بڑی کاوش سے سو ناموں کی ایک فہرست بنائی ہے۔ ان میں سے جو بھی تمہیں پسند ہو، رکھ لو... ." چچی جان کا راولپنڈی سے مکتوب وصول ہو گا "ننھی کے لئے میں نے سولہ نام تجویز کئے ہیں۔ لیکن تمہیں بھلا یہ کہاں پسند آئیں گے۔ پھر بھی جو کچھ میں نے سوچا ہے حاضر ہے"۔ نانا جان اگر بقیدِ حیات ہیں تو لبِ گور سے یہ خط تحریر فرمائینگے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

لیکن عزیزم! مجھے اپنے غم سے نجات مل گئی۔ تمہاری گود بھری ہوئی۔ میری ساری زندگی

سرسبز ہو گئی۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے اتنی مدت کے بعد تمہارے نخلِ حیات کو بار آور فرمایا ہے۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے .... میں ایک ہزار ناموں کی ایک چھوٹی سی فہرست ارسال کر رہا ہوں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ اس میں سے کوئی نہ کوئی تم اپنے جگر گوشے کے لئے ضرور پسند کر لو گی۔" قبلہ دادا جان اگر کہیں پاس ہی آخری سانس لے رہے ہیں تو اسلام کی سیزدہ صد سالہ روایات کی تاریخ لے کر بیٹھ جائیں گے اور اس میں سے تمام نامور آدمیوں کے نام چُن چُن کر والدین کے سامنے بکھیر دیں گے کہ وہ اس ڈھیر میں سے ایک اپنے آنکھ کے تارے اور راج دلارے کے لئے منتخب کر لیں۔

آدمی کس کی سُنے، کس کی نہ سنے۔ کس کا کہا مانے، کس کا نہ مانے۔ کس کا دل رکھے اور کس کا واپس کر دے .... ناموں کی فہرستوں پر غور کرتا رہے اور بچوں کے عزیزوں کے جذبات و احساسات کو بھی پیشِ نظر رکھے تو بہت ممکن ہے۔ بچہ بوڑھا ہو کر اپنے والدین کے نام پر نظرِ ثانی شروع کر دے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر والدین گھبرا کر جلدی جلدی میں اپنے لختِ جگر کا نام مقرر کر دیتے ہیں۔

اولاد کا نام مقرر کرنے میں بعض اوقات اس گھبراہٹ، عجلت اور اُلجھن کے علاوہ توہم پرستی کا دخل بھی ہوتا ہے۔ اگر لڑکا یا لڑکی بہت دیر کے بعد اور بڑی منتیں ماننے کے بعد پیدا ہوا ہے تو اس کا نام بھی اسی مناسبت سے رکھا جائے گا۔ لڑکا ہے۔ تو مثال کے طور پر اللہ دتہ، پیراندتہ۔ خدا بخش، نبی بخش۔ لڑکی ہے تو اللہ رکھی، پیراندتی، خیراتن۔ حیاتن وغیرہ۔ اور اگر بہت سے بچے مرنے کے بعد خدا نے لڑکا یا لڑکی دی ہے،

تو نام کچھ یوں ہو گا۔ اللہ جوایا۔ رُلدو، گھسیٹا، کلن، کلوا، کلب علی وغیرہ۔

انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے۔ کتّے کو کوئی برا نام دو اور اسے پھانسی پر لٹکا دو۔ لیکن چونکہ بچّے کو پھانسی دینا مطلوب نہیں ہوتا۔ لہٰذا اُس کے واسطے اچھے سے اچھا نام چُننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں والدین کافی دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ قرآن سے فالیں نکالی جاتی ہیں۔ زائچے تیار کرائے جاتے ہیں۔ نجومیوں اور جفّاروں سے رجوع کیا جاتا ہے۔ پیروں اور فقیروں کی رائے طلب کی جاتی ہے۔ پھر جا کر بچے یا بچی کے لئے مناسب و موزوں نام ملتا ہے۔ لیکن اولاد جونہی سنِ شعور کو پہنچتی ہے۔ اپنے نام کو اُلٹ پلٹ کے دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ والدین کے جذبات و احساسات بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں اور اپنے نام سے بددلی اور بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہونا یہ چاہیئے کہ سنِ شعور کو پہنچنے تک اولاد بالکل بے نام رہے۔ جونہی لڑکا یا لڑکی شعر یا افسانہ لکھنے کے قابل ہو جائے۔ اس سے کہہ دیا جائے۔ لو بھئی، اب تم جو چاہو اپنا نام رکھ لو۔ ایسا کرنے سے نہ تو والدین کا دل دُکھے گا اور نہ اولاد ہی کو شکایت کا موقع ملے گا۔

مشہور ترقی پسند شاعر نذر محمد کا نام اگر اُن کی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہوتا تو ظاہر ہے کہ انہیں اس میں قطع و برید کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوتی۔ اگر وہ نذر محمد ہی پر طوعاً و کرہاً قانع رہتے تو آج اردو ادب یقیناً ن۔ م۔ راشد کی ترقی پسند شاعری

سے محروم رہتا۔ شروع شروع میں یعنی قطع وبرید کے فوراً بعد کچھ عرصے تک انہیں اپنے نام سے کچھ اجنبیت اور غیریت ضرور محسوس ہوتی ہوگی۔ مگر اب وہ کچھ اس کے ایسے عادی ہوگئے ہیں کہ اگر کوئی انہیں نذر محمد کے نام سے پکارے تو وہ سمجھیں گے کسی اور آدمی کو بلایا جا رہا ہے۔

ایک اور شاعر ہیں۔ ماں باپ کا رکھا ہوا نام فضل دین ہے مگر اس زمانے میں جبکہ دین اور اس کے فضل کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ یہ نام کتنا بوسیدہ معلوم ہوتا ہے۔ فضل دین صاحب کو اس کا شدید احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اس پرانے نام کو انجم رومانی ایسے رومانٹک نام میں تبدیل کر دیا۔ سینے کا یہ بوجھ ہلکا ہوتے ہی آپ نے شاعری شروع کر دی جو بڑی ہلکی پھلکی ہے اگر وہ اپنا نام فضل دین ہی رہنے دیتے تو ناقدین ادب یقیناً اُن کے کلام کو پرانی شاعری کے مٹکے میں پھینک دیتے۔

وقار انبالوی صاحب نے پہلے اپنا نام غالطف مولانوی رکھا۔ چنانچہ اس نام سے "ہمایوں" میں اُن کے اکثر مضامین چھپتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے غالطف مولانوی کے سامنے اپنا اصلی نام کاظم علی رکھ کر دیکھا تو یہ تبدیلی انہیں باوقار معلوم نہ ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے دوسرا چولا بدلا اور وقار انبالوی ہو گئے۔

ابوالکلام آزاد پہلے معین الدین احمد تھے۔ ساغر نظامی، صمد یار خان، ان کے اُستاد سیماب، عاشق حسین، حضرت جوش، شبیر حسن خان، جگر مُرادآبادی، علی سکندر، سید جالب، بشارت علی اور نوح ناروی بندے حسن۔

قتیل شفائی کے ساتھ اُن کے والدین نے یقیناً ظلم کیا تھا جو اورنگ زیب نام رکھ دیا۔ کہاں ترقی پسند شاعری اور کہاں رجعت پسند اورنگ زیب۔

میراجی کے نام سے کون واقف نہیں۔ آپ بھی شاعر ہیں اور ایسے ترقی پسند شاعر ہیں کہ ان کا بیشتر کلام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر رہتا ہے۔ آپ کا اصلی نام ثناء اللہ تھا جس کا مطلب واضح ہے۔ اگر آپ ثناء اللہ ہی رہتے تو آپ کو مجبوراً ایسے اشعار کہنے پڑتے جن کا مطلب واضح ہوتا۔ لیکن ثناء اللہ کی زندگی کا مقصد چونکہ یہ نہیں تھا اور مُبہم پُراسرار قسم کی شاعری کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہیں اپنا نام بھی کچھ اسی قسم کا رکھنا پڑا۔

مرزا ادیب بی۔ اے آنرز شاعر تو نہیں۔ لیکن شاعرانہ طبیعت رکھنے والے افسانہ نویس ضرور ہیں۔ آپ کا اصلی نام دلاور علی ہے۔ نہ تو آپ دلاور ہیں اور نہ دل بدست آور چنانچہ جونہی آپ کو اپنے نام اور اپنے کردار میں بُعد محسوس ہُوا۔ آپ ارتقا کی تمام منزلیں ایک ہی جست میں طے کر کے میرزا ادیب بی۔ اے آنرز بن گئے۔

اردو ڈرامہ نگاری کے دو نقاد بہت مشہور ہیں۔ جن کا نام ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ چپکا رہتا ہے۔ ہماری مراد محمد عمر نورالٰہی صاحبان سے ہے۔ شوکت تھانوی صاحب کا اصلی نام محمد عمر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تھانے میں جب شوکت صاحب نے ظرافت نگاری شروع کی ہوگی تو اس لئے کہ اُنہیں بھی اپنے لئے ایک نورالٰہی پیدا کرنا پڑے گا۔ خوف الٰہی کھا کر اپنا نام تبدیل کر لیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر میں کافی رعب ہے۔ لیکن اصلیت کی طرف جائیں تو صرف محمد دین رہ جاتا ہے۔ جس کے ساتھ ڈوکٹریٹ انمل بے جوڑ سی لگتی ہے۔ احمد شاہ بخاری، اے، ایس بخاری ہی کی شکل میں پھلے لگتے ہیں۔

اُن کی مزاح نویسی پر احمد شاہ بالکل چسپاں نہ ہوتا۔ کیونکہ لوگوں کا خیال احمد شاہ ابدالی کی طرف چلا جاتا جسے مزاح اور ظرافت کے بجائے لوٹ مار سے دلچسپی تھی

بہزاد لکھنوی کی اصلیت نور محمد ہے۔ یوں تو اُن کی بھوری داڑھی اور چوڑی پیشانی سے کافی نور برستا ہے۔ لیکن ریلوے کی ملازمت کے دوران میں جب آپ کو محسوس ہوا کہ اُن کی جبلت کو نور سے زیادہ رنگوں سے نسبت ہے تو آپ فوراً کایا کلپ کرا کے بہزاد لکھنوی بن گئے اور بڑے سکون اور اطمینان سے شاعری شروع کر دی

خضر تمیمی صاحب اگر مولا بخش ہی رہتے تو ظاہر ہے۔ دنیائے ادب میں اُن کی وہی حیثیت ہوتی جو اسکولوں میں استاد کے ڈنڈے کی ہوتی ہے۔

فلموں کے مشہور گیت لکھنے والے ڈی۔ این مدھوک صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک بے نیاز انسان ہیں۔ لیکن ان کو بھی اپنا اصلی نام جو کہ دینا ناتھ ہے پسند نہ آیا اور اسے ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی طرح فرنگی رنگ میں رنگ دیا۔

فلموں کا ذکر آیا ہے تو لگے ہاتھوں ناموں کی شدھی کا بھی ذکر خیر و شر ہو جائے۔ پورن بھگت بن رہا تھا۔ دیوکی بوس نے پورن کے رول کے لئے لکھنو کے ایک مسلم نوجوان علی میر عرف محسن کو منتخب کیا۔ لیکن سوال پیدا ہوا کہ ہندو قوم معترض

ہو گی۔ کہ اتنے بڑے بھگت کا روپ ایک مسلمان نے دھارن کیا ہے چنانچہ اس سوال کے پیش نظر علی میر کے نام کی شدھی کر دی گئی اور وہ اس فلم میں کمار کے نام سے پیش ہوا۔

اس کے بعد مسلمان ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو ہندوانہ نام دے کر پیش کرنے کا ایک فیشن بن گیا۔ ذکریا خان جو ٹھیٹ پٹھان ہے۔ جینت ہو گیا اور یوسف، دلیپ کمار کشمیری نذر کی شدھی ہوئی اور وہ "امر" ہو گیا۔

اب ایکٹرسوں کو لیجئے۔ تاجور (تاجور نجیب آبادی صاحب سے اس تاجور کا کوئی تعلق نہیں) وینا بن کر فلموں میں گونجنے لگی اور شاہدہ کو جب فلموں میں مشہور کیا گیا تو اس کا نام نینا تھا۔

دو غلے نام بھی رکھے گئے۔ جن سے ہندو مسلم اتحاد کی بُو آئے۔ مثال کے طور پر ممتاز شانتی، گیتا نظامی وغیرہ وغیرہ، ایک ایکٹرس کا نام ہے آشا پوسلے۔ سمجھا کرے کوئی۔

ناموں کے معاملے میں سکھ حضرات دوسروں کے مقابلے میں بہت ثابت قدم واقع ہوئے ہیں۔ سردار کھڑک سنگھ اتنے برس گذر گئے ہیں انہیں کھڑکتے ہوئے۔ لیکن مرحبا ہے کہ ابھی تک ان کے دل میں یہ کھڑکھڑاتا نام تبدیل کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔

تقسیم ہندوستان سے پہلے لاہور میں ایک ودھاوا سنگھ تھے۔ آپ کو اس بدوضع نام سے بالکل نفرت پیدا نہ ہوئی اور جب تک یہاں دکان رہی۔ برابر "بھائی

ددھاوا سنگھ کے اچار شلجم" کا اشتہار دیتے رہے۔

سکھوں میں کئی لاہورا سنگھ ہیں، پشاورا سنگھ ہیں۔ بھاوڑا سنگھ، ہنوڑا سنگھ ہیں ہمارا خیال ہے۔ ان میں سے اگر کوئی ترقی پسند شاعر بھی کیوں نہ بن جائے۔ تو بھی وہ اپنا نام تبدیل نہیں کرے گا۔

ع سر جائے تے بجاویں جائے میری رکھی صدق نہ جائے

سکھوں کی جرأتِ رندانہ کی داد دینی پڑتی ہے۔ ورنہ ایمان کی بات ہے۔ کون بھاوڑا سنگھ جیسے بھاری بھرکم نام کے ساتھ اپنی ساری زندگی گزار سکتا ہے۔

ہلکے پھلکے اور خوبصورت نام رکھنے میں گانے اور مجرا کرنے والیاں پیش پیش ہیں۔ شمشاد ہے، صنوبر ہے، گلاب ہے، نیلم ہے، الماس ہے، انوری ہے، مشتری ہے، زہرہ ہے اور یہ نام کچھ اس طرح اس خاص طبقے سے منسوب ہوئے ہیں کہ دوسروں کے لئے شجرِ ممنوعہ اور حجرِ ممنوعہ بن گئے ہیں۔

گانے والیوں میں ببوا بائی، چھوٹی موٹی بائی اور طمنچہ جان ایسے عجیب و غریب نام بھی موجود ہیں۔ آخر الذکر تو ترقی پسندی کی آخری حد تک جا پہنچا ہے مگر صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے — آج کل دوسری اجناس کی طرح ناموں کا بھی قحط ہے، نئے نام تلاشِ بسیار کے بعد بھی دستیاب نہیں ہوتے۔ ہمارا خیال ہے۔ طمنچہ جان نے نئے ناموں کا ایک بالکل ہی نیا راستہ کھول دیا ہے۔ بڑی آسانی سے ایسے مسلح نام وضع کئے جا سکتے ہیں۔

توپ کماری - اینٹی ایر کرافٹ بیگم - ایٹم الدین - ٹینک سنگھ - بندوق بانو
گولہ بخش - مشین گن داس - بل ڈوزر خاں - سنگین خاتون - مائن کور - تھری ناٹ
تھری چند - ہینڈ گرینیڈ دیوی - مورٹر مل - بومبر بائی - دی وَن جان - دِی ڈوبوس
وغیرہ وغیرہ

میں فلم کیوں نہیں دیکھتا

بہت دنوں سے میری خواہش تھی۔ کوئی مجھ سے سوال کرے کہ میں فلم کیوں نہیں دیکھتا۔ گھر میں کئی دفعہ مجھ سے پوچھا گیا۔ "میں بھنڈی کیوں نہیں کھاتا"۔ یار دوستوں نے متعدد بار دریافت کیا۔ میں پتلون کیوں نہیں پہنتا۔ گھر اور گھر کے باہر یہ استفسار بھی کئی مرتبہ ہوا کہ میں بال کیوں نہیں کٹواتا۔ پر مجھ سے میری خواہش کے مطابق یہ کسی نے پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ میں فلم کیوں نہیں دیکھتا؟ — حالانکہ مجھے جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ فلم ایک زمانہ ہوا مجھے بے حد مرغوب تھے۔ ایک ایک دن میں تین تین فلم دیکھتا اور جو پسند آجائے اسے بار بار دیکھتا تھا۔ امرتسر سے لاہور اور جالندھر جا جا کے دیکھتا تھا اور مجھے یاد ہے۔ ایک فلم کے لئے جس میں میری پسندیدہ ہیروئن کام کر رہی تھی۔ مجھے دہلی تک کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ لیکن ایسا کیا ہوا جو میں نے فلم دیکھنے بند کر دیئے۔

بہت دنوں کے بعد یہ مجھے آج موقعہ ملا ہے کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کردوں ورنہ جب بھی فلم دیکھنے کی دعوت پر میں نے اپنے کسی دوست سے کہا "میں فلم نہیں دیکھا کرتا" اور متوقع رہا کہ وہ مجھ سے پوچھے گا "آخر کیوں؟" — مجھے ہمیشہ ناامیدی ہوئی۔ کسی نے کھٹ سے موٹر کا دروازہ بند کیا اور اچھا کہہ کر یہ جا وہ جا۔ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور میں نے بجائے "آخر کیوں؟" کے یہ سنا "تم عجیب و غریب آدمی ہو"۔ اور کسی نے بالکل بنیوں کی طرح کہا "اچھا ہے، میرے پیسے بچ گئے"۔

کوئی زمانہ تھا کہ ایڈی پولو سے لے کر جون گلبرٹ اور میری پکفورڈ سے لے کر گلوریا سوینسن تک مجھے تمام ایکٹرایکٹرسوں کے نام، ان کے پتے اور ان کی عمریں یاد تھیں۔ للین گش اور اس کی بہن ڈروتھی گش کے قد کی لمبائی تو مجھے ابھی تک یاد ہے لیکن آج مجھ سے کوئی پال روبسن کی بات کرے تو میرا دھیان روبنسن کروسو کی طرف چلا جاتا ہے اور جنجر روجرز کی تعریف کرے تو میرے منہ میں بمبئی کی روجرز کمپنی کے بنائے ہوئے جنجر کا ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے دوست احباب شانتا دین، شانتا ہبلی کر اور شانتا موزمدار کی کردار نگاری پر بحث شروع کرتے ہیں تو میں چلّا دیتا ہوں "شانتی! اشانتی!"

پری چہرہ نسیم بانو، حور تمثال وینا، آہو چشم راگنی، کافرادا ثریا اور مرمریں جسم شمیم سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ سوچیں گے۔ شاید میں دنیا تیاگ کے سنیاسی بن گیا ہوں، بدن پر بھبوت مل کے میں نے کسی پہاڑ کی چوٹی پر آسن جما لیا ہے — جی نہیں، میں ابھی تک آپ ہی کی دنیائے رنگ و بو میں سانس لے رہا

ہوں۔ کل لگا کچھ بھروسہ نہیں۔ ابھی تک تو کھاتا ہوں، پیتا ہوں، سوتا ہوں، جاگتا ہوں اچھے افسانے پڑھ کر داد دیتا ہوں، موزوں شعر سن کر پھڑک بھی جاتا ہوں۔ لیکن صاحب میں فلم نہیں دیکھتا۔

کوئی زمانہ تھا میرے کمرے کی زینت صرف ایکٹرا ور ایکٹرسوں کی تصویریں ہوا کرتی تھیں۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ ان تصویروں کے فریم میں خود اپنے ہاتھ سے بنایا کرتا تھا لیکن آج میرے کمرے میں آپ کو صرف ڈاسن کے کارٹون آویزاں نظر آئیں گے۔ جو بندروں کے نفسیات کی تصویر کشی کا ماہر ہے ــــ آپ سوچئے اتنا بڑا انقلاب کیسے برپا ہوا؟

میرے دل ودماغ میں ایک بہت ہی خوبصورت صنم خانہ تھا جس میں ہر شام اپنے پسندیدہ ایکٹروں کی آرتی اتارنے میں مجھے روحانی مسرّت حاصل ہوتی تھی مگر ایسا کیا ہوا جو میں نے عقیدت کے سب چراغ بجھا دیئے۔ سارے پھول پاؤں تلے روند ڈالے ــــ کیا مجھ میں غزنوی کی روح حلول کر گئی تھی؟ ــــ جی نہیں، میری داستان بالکل مختلف ہے

بعض لوگ فلم اس لئے نہیں دیکھتے کہ آشوبِ چشم میں مبتلا ہیں۔ بعض اس لئے کہ فلم شروع ہوتے ہی ہال میں سو جاتے ہیں۔ کچھ اس لئے کہ رقیق القلب ہیں۔ پردے پر کھلم کھلا عشق لڑتا دیکھ کر اُن پر دل کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو شیطانی کھیل سمجھ کر اُن سے دُور رہتے ہیں۔ لیکن میں کیوں ان سے احتراز کرتا ہوں ــــ میری بینائی کمزور ہے۔ لیکن چشمہ اس کی تلافی کے لئے میری ناک پر ہر وقت موجود

رہتا ہے۔ میرا دل چشمِ بددُور کافی مضبوط ہے۔ ثبوت کے لئے ڈاکٹر کا لیا ہوا کارڈیو گرام موجود ہے۔ میں فلموں کو انسانوں کا کھیل سمجھتا ہوں۔ پھر وجہ کیا ہے کہ میں فلم نہیں دیکھتا۔ میں فلم نہیں دیکھتا۔ یہ سُن کر ان لوگوں کو تو اور بھی زیادہ حیرت ہوگی۔ جو مجھے فلم نویس کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ سوچتے ہوں گے۔ یہ کیسا شخص ہے، فلم کے لئے کہانیاں لکھتا ہے، مکالمے لکھتا ہے۔ ایک فلم میں قریب قریب ایکٹ بھی کر چکا ہے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو لگ بھگ دس برس سے اس صنعت میں جھک مار رہا ہے اور کہتا ہے۔ میں فلم نہیں دیکھتا — صریحاً بن رہا ہے۔

صاحب حاشا وکلا، میں بن نہیں رہا۔ روزِ حشر میرا گریبان کسی بھی ایکٹرس کے ہاتھ میں ہو جو میں آپ کے سامنے بناوٹ سے کام لوں — لیجئے، میں آپ سے سچ سچ عرض کرتا ہوں — بناوٹ اور صرف بناوٹ نے میرا دل کھٹا کیا۔ مرتے وقت مجھے کلمہ نصیب نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ میں آج بالکل فلم نہیں دیکھتا۔

آج سے بارہ برس پہلے کی بات ہے۔ میں نے بمبئی کے فلمی سومنات پر چار حملے کئے۔ آخری حملہ میری زندگی کی تاریخ میں بہت مشہور اور اہم ہے۔ کیونکہ میں ایک اسٹوڈیو کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا — خوفناک پٹھان پہرے دار کی نظر بچا کر جونہی میں پھاٹک کے اندر گھسا، چاروں طرف سے "آدم بُو، آدم بُو!" کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک کالی عورت پاس سے گزری تو میں نے دل میں دُعا مانگی کہ وہ مجھ پر عاشق ہو جائے اور الف لیلیٰ کی ہیروئنوں کی طرح کوئی افسوں پھونک کر

مجھے مکھی بنا دے۔ تاکہ میں آنے والی آفت سے محفوظ ہو جاؤں مگر وہ کوٹھے مٹکاتی چلی گئی۔ اتنے میں ایک شور برپا ہوا اور میں نے دیکھا کہ بہت سے آدمی زرہ بکتر پہنے ہاتھ میں ننگی تلواریں لئے ایک کونے سے نمودار ہوئے اور ناچتے پھدکتے ایک بہت بڑے اصطبل میں داخل ہو گئے ــــ ان میں سے ایک کی تلوار ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اٹھانا چاہی تو میرا ہاتھ ہوا ہی میں ٹل کر رہ گیا ـــــ تلوار لکڑی کی تھی۔

انگوٹھے پر لب لگا کر میں ابھی اس تلوار کی دھار ہی دیکھ رہا تھا کہ سامنے سے ایک بڑی بڑی مونچھوں والا قوی ہیکل دیو نمودار ہوا ــــ یہ پھاٹک کی طرف جانے ہی والا تھا کہ ایک آواز بلند ہوئی "اے، کمپنی کا مال لئے کدھر جانا ہے"

مونچھوں والا دیو کانپ گیا اور لرزاں آواز میں بولا "کیا ہے سیٹھ؟"

سیٹھ نے جسے میں راجہ اندر سمجھا تھا بارعب آواز میں پوچھا "یہ مونچھ کس کا ہے"

مونچھوں والے دیو نے اپنی مونچھوں کو مروڑا دے کر بڑے عجز سے کہا "سیٹھ یہ تو میری اپنی ہے"

سیٹھ صاحب کا اطمینان ہوا۔ چنانچہ انہوں نے حکم دیا "اب تم جانے کو سکتا ہے"

دیو جانے کو سک گیا ـــ یعنی چلا گیا تو سیٹھ صاحب نے مجھے پکڑ کر ملازم رکھ لیا دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام سعادت حسن منٹو نہیں صرف منشی ہے اور

میرا کام یہ ہے کہ فلم ڈائرکٹر کے لئے ہر پانچ منٹ کے بعد بازار سے پان لاؤں اور چوں نہ کروں۔ جب اس سے فراغت ہو تو اُن کی خواہش کے مطابق غلط سلط اردو میں ڈائلاگ لکھ دیا کروں اور چوں نہ کروں۔

اُن دنوں میری بھی زبان سے کوئی اتنی دوستی نہیں تھی۔ اس لئے ڈائرکٹر صاحب کے ساتھ مل کر ہر روز اُس کی ٹانگ توڑتے وقت میرے جذبات مجروح نہیں ہوتے تھے۔ لیکن صاحب ایک روز معاملہ بہت ہی سنگین ہو گیا جب سیٹھ صاحب نے ڈائرکٹر صاحب کے ساتھ ہاتھ ملایا اور یہ خوشخبری سُنائی "دادا ابرِ ھویں فلم کے رائٹس آج میں نے بیچ دیئے ہیں۔" ڈائرکٹر صاحب نے مبارکباد دی اور سیٹھ سے پوچھا "نام کیا رکھا گیا ہے؟" سیٹھ صاحب مسکرائے "ایک دم فائن ہے — فرج ادا" ڈائرکٹر صاحب میری طرف متوجہ ہوئے اور نام کی تصحیح کرتے ہوئے کہا "منشی صاحب۔ آج سے "فرجِ ادا" کی کہانی لکھنی شروع کر دیجئے — لیکن پہلے میرے لئے ایک دیسی کالا کانڈی .... "

میں نے قطع کلامی کی اور کہا "دیسی کالا کانڈی، سینکی لی، سوپاری، انگلی پر چونا اور ایک پاسنگ سوپ سگرٹ .... یہ میں سب ابھی حاضر کئے دیتا ہوں، لیکن یہ "فرض ادا" کی ترکیب بالکل غلط ہے"۔

سیٹھ صاحب نے غصّے سے پوچھا "کیا بولا"

میں بولا "میں یہ بولا کہ جو کچھ آپ بولے ہیں، ہماری بولی میں چلنے کو نہیں

سکے گا۔"

ڈائرکٹر صاحب بولے "کیسے چلنے کو نہیں سکے گا۔"

میں بولا "ایسے چلنے کو نہیں سکے گا کہ یہ ایک دم رونگ ہے ــــ ادائیگی فرض ہو سکتا ہے۔ فرض ادائیگی کہہ لیجئے۔ زیادہ سے زیادہ ادائے فرض کہہ لیجئے کہ اس کا مطلب بھی وقت آنے پر نکال لیا جا سکتا ہے۔ لیکن از برائے خدا "فرضِ ادا" ٹائیٹل فوراً چینج کر دیجئے۔"

سیٹھ صاحب نے مجھے گھور کے دیکھا اور کہا "تمہارا بھیجا پھرے لا ہے منشی ــــ ٹائیٹل چینج ہونے کو نہیں سکتا۔ اس واسطے کہ ہم فلم بیچ چکا ہے۔" یہ سن کر میرا بھیجا یعنی دماغ پھر گیا ــــ اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں کمپنی کے باہر تھا۔

دوسری کمپنی سے باہر نکلنے کی داستان بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ تازہ فلم کا نام "الّو کے دو پٹھے" تجویز ہوا۔ میں نے اعتراض کیا کہ یہ الّو کے دو پٹھے کیا ہوا۔ دو الّو کے پٹھے ہونا چاہئے۔ جواب ملا "تم کون ہوتے ہو۔ مال پانی ہمارا خرچ ہو رہا ہے ہم چاہے گا تو پٹھے کے دو الّو بھی چلے گا" ــــ چنانچہ صاحب "الّو کے دو پٹھے" کی شوٹنگ شروع ہو گئی اور میں کمپنی کے باہر تھا۔

فلموں سے اب میرا دل ٹوٹنا اور کھٹا ہونا شروع ہوا اور چند برسوں ہی میں چڑچڑا اور ترش ہو کر بالکل اچار بن گیا۔

چھوٹی موٹی فلم کمپنیوں میں در بدر ہونے کے بعد آخر کار مجھے ایک ایسے فلمی

ادارے میں جگہ مل گئی جس کا بہت نام تھا اور جس کے بنائے ہوئے فلم بہت صاف ستھرے ہوتے تھے — اس فلمی ادارے کی چار دیواری میں جہاں چار برس میں نے فلم نویسی کی، آہستہ آہستہ میں نے اپنے ذوقِ فلم بینی کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔

تجہیز و تکفین کی داستان بہت لمبی ہے اور مجھے صرف چند کالموں میں اختصار کے ساتھ متعدد باتیں بیان کرنا ہیں۔

ایک ایکٹرس کی شہ سواری کا بہت شہرہ تھا لیکن جب گھوڑے پر سوار ہونے کا وقت آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک لکڑی کا گھوڑا اسیٹ پر لایا جا رہا ہے — یہ گھوڑا بھی پورا نہیں تھا، صرف پیٹھ ہی پیٹھ تھی جس پر کاٹھی لگی ہوئی تھی۔ تھوتھنی اور دُم بالکل گدھے کے سینگ — ایکٹرس صاحبہ کو تین آدمیوں نے سہارا دے کر اس شئے عجیب پر سوار کیا۔

لائٹ اون ہوئی۔ ڈائرکٹر صاحب نے حکم دیا "گو" — ایک آدمی نے جلدی سے ایکٹرس صاحبہ کے ہاتھ میں لگامیں تھمائیں اور دوسرے نے ہولے ہولے لکڑی کے اس نامکمل گھوڑے کو ہلانا شروع کیا — دیر تک یہ سلسلۂ جنبانی فلمائی جاتی رہی۔

دوسرے روز آؤٹ ڈور شوٹنگ ہوئی۔ سرکس کے ایک ماہر گھڑ سوار کو اس ایکٹرس کی ساڑھی بلاؤز پہنایا گیا اور ایسے گھوڑے پر جو پٹھے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتا تھا اور بار بار الف ہو جاتا تھا۔ سوار کرا کے اس کے مختلف کرتب فلمائے گئے

— یہ سب ٹکڑے جوڑ کر جب پردے پر آئے تو میری حیرت نہ رہی۔ آنکھوں نے دیکھا کہ وہ ایکٹرس ہی سب کچھ کر رہی ہے۔

ہیروئن کے ہاتھ کا کلوز اپ لینا تھا۔ لوگوں کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ اس کے ہاتھ بہت ہی خوبصورت ہیں مگر اس "پری پیکر" کی انگلیاں نہایت ہی بدنما تھیں۔ ٹیڑھی میڑھی — ڈائرکٹر صاحب کو فوراً سوجھی۔ جھٹ سے دس بارہ ایکسٹرا لڑکیاں منگوائیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ اچھے تھے۔ چنانچہ ایک دم ان پر سفیدی اور سُرخی مل کر کلوز اپ لے لیا گیا اور اس پری پیکر کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ اس وقت چچا غالب یاد آ گئے۔ ع

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

دکھانا تھا کہ بہت زوروں کا جھکڑ چل رہا ہے اور خطرناک قسم کا مینہ برس رہا ہے — میں نے دیکھا کہ مچان پر کئی آدمی پھولوں کو پانی دینے والے بھپارے میں پانی بھر بھر چھوڑ رہے ہیں۔ ایک طرف ہوائی جہاز کا پنکھا موٹر کے ذریعے سے چل رہا ہے۔ پاس ہی دو آدمی پتّوں اور ٹہنیوں کی ٹوکریاں اُٹھائے کھڑے ہیں اور مٹھیاں بھر بھر کے یہ پتّے اور ٹہنیاں پنکھے کے مُنہ پر مار رہے ہیں — سامنے کپڑے کا آسمان تنا ہے۔ ایک آدمی کبھی سوئچ آن کرتا ہے۔ کبھی آف اور دوسرا ٹین کی ایک بہت بڑی چادر کھڑکھڑا رہا ہے — پردے پر یہ منظر دیکھا تو عقل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے — منوں پانی برس رہا تھا۔ درخت تیز آندھی کے مقابلے میں جھکے جا رہے تھے۔

ٹہنیاں چیخ رہی تھیں۔ خوفناک قسم کی بجلی چمک اور کڑک رہی تھی۔ اور ہیرو اس طوفان میں گھرا اپنی کشتی مردانہ وار کھے رہا تھا۔

کڑاہے میں دُودھ اُبل رہا ہے ـــ لیکن اصل میں دیواروں پر پھیرنے والی سفیدی ہے۔

وادیٔ کشمیر میں برفباری ہو رہی ہے ـــ لیکن بہت سے مزدور کاغذ کے بنے ہوئے سروں پر اوپر سے صابن کی ہوائیاں اور کاغذ کے ننھے ننھے ٹکڑے منتشر کر رہے ہیں۔

بڑے حسین قسم کا کہرا چھایا ہوا ہے جس میں ملفوف ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کے ساتھ لگے محبت بھری باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن سیٹ پر دونوں کا سانس سوکھی گھاس کے دُھوئیں میں گھُٹ رہا تھا۔

ابھی ابھی ہیروئن ہیرو کے ساتھ سیٹ پر ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔ شوٹنگ شروع ہوئی تو میک اپ مین ڈروپر سے اس کی آنکھوں میں گلیسرین کے چند قطرے ڈال دیئے اور لو صاحب آنسوؤں کے موتی ڈھلکنے لگے۔

گا کوئی رہا ہے، لب کسی کے ہل رہے ہیں۔ لکڑی کا ٹیلی فون میز پر دھرا ہے پاس ہی ایک آدمی گھنٹی لئے کھڑا ہے۔ وہ بجاتا ہے تو ہیرو صاحب جھٹ سے ریسیور اٹھاتے ہیں جیسے سچ مچ کال آئی ہے۔ ہیروئن گیسو بریدہ ہے۔ لیکن پردے پر دیکھو تو کسی زلف دراز تیل کا اشتہار دکھائی دیتی ہے۔ گھونسا چلتا ہے۔ لگتا لگاتا

کسی کے بھی نہیں۔ لیکن دو تین آدمی چت ہو کے رہ جاتے ہیں۔ میز پر پھلوں کے انبار لگے ہیں۔ لیکن ان میں صرف ایک کیلا اصلی ہے جو ہیرو کے والد بزرگوار کو کھانا ہے۔ باقی سب مٹی کے ہیں۔ چلچلاتی دھوپ ہے لیکن کیمرے پر ریڈ فلٹر لگایا۔ اور لیجئے دھوپ ٹھنڈی چاندنی میں تبدیل ہو گئی ـــــ زیبرا نہیں ملتا تو گدھے ہی پر سیاہ و سفید دھاریاں کھینچیں اور اُسے زیبرا بنا دیا۔

میدے کی چھلکی پھانک کر آدمی مر رہا ہے اور لوگ واویلا کر رہے ہیں ـــ آدمی اوپر سے نیچے گر رہا ہے۔ کیمرہ اُلٹا گھما دیا۔ پردے پر وہ اچک کر اوپر جاتا دکھائی دے گا جیسے اُس کے اسپرنگ لگے تھے۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھے گا۔

یقین مانئے یہ بناوٹیں دیکھ دیکھ کے میرا دل کھٹّا ہو گیا اور انگریزی ضرب المثل کے اونٹ کی کمر اس آخری تنکے نے توڑ دی۔ جب میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بنے ہوئے فلم کو ہال میں تماشائیوں کے ساتھ دیکھا اور ہیروئن کی مصنوعی پلکوں سے پھسلتے ہوئے گلیسرینی آنسوؤں نے مجھے ایک سے زیادہ بار رُلایا۔

کتنا بڑا فریب ہے یہ فلم کہ خود فریب ساز بھی فریب کھا جاتے ہیں۔ خدا اب مجھے وہ دن نہ دکھائے کہ میں فلم دیکھوں۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی۔ یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل، ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل ـــــ باغ پہنچنے سے پہلے ظاہر ہے کہ میں نے کچھ بازار اور کچھ گلیاں طے کی ہوں گی اور میری آنکھوں نے کچھ دیکھا بھی ہوگا۔ پاکستان تو پہلے ہی کا دیکھا بھالا تھا۔ پر جب سے زندہ باد ہوا ڈھ کل دیکھا۔ بجلی کے کھمبے پر دیکھا۔ پرنالے پر دیکھا۔ شہ نشین پر دیکھا چھجے پر دیکھا۔ چوبارے پر دیکھا۔ غرضیکہ ہر جگہ دیکھا اور جہاں نہ دیکھا وہاں دیکھنے کی حسرت لئے گھر لوٹا۔

پاکستان زندہ باد ـــ یہ لکڑیوں کی ٹال ہے ـــ پاکستان زندہ باد، ظفر مہاجر ہیر کٹنگ سیلون۔ پاکستان زندہ باد۔ یہاں تالے مرمّت کئے جاتے ہیں ـــ پاکستان زندہ باد، گرما گرم چائے ـــ پاکستان زندہ باد ـــ بیمار کپڑوں کا ہسپتال ـــ پاکستان زندہ باد۔ الحمدللہ کہ یہ دکان سید انوار حسین مہاجر جالندھری کے نام

الاٹ ہو گئی ہے۔

ایک مکان کے باہر یہ بھی لکھا ہوا دیکھا۔ پاکستان زندہ باد۔ یہ مکان ایک پارسی بھائی کا ہے...... یعنی حضرت کہیں اسے بھی نہ الاٹ کرا بیٹھے گا

صبح کا وقت تھا۔ عجب بہار تھی اور عجب بیبر تھی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں۔ ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ میں نے کہا چلو لسی ہی پیتے ہیں۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں۔ بجلی کا پنکھا چل تو رہا ہے۔ لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا "یہ اُلٹے رُخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟"۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا "دیکھتے نہیں ہو"۔ میں نے دیکھا۔ پنکھے کا رُخ قائد اعظم محمد علی جناح کی رنگین تصویر کی طرف تھا جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی۔ میں نے زور کا نعرہ لگایا "پاکستان زندہ باد" اور لسی پیئے بغیر آگے چل دیا۔

بند دکان کے تھڑے پر ایک آدمی بیٹھا پوریاں تل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ ابھی پرسوں میں نے اس دکان سے چپل خریدے تھے۔ یہ پوری والا کدھر سے آگیا۔ خیال آیا۔ شاید کوئی دوسری دکان ہو۔ لیکن بورڈ وہی تھا۔ سامنے وہی فسادات میں جھلسا ہوا مکان تھا جس کی برساتی میں بجلی کا پنکھا لٹک رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا۔ آگ جلانے میں اس نے بھی کافی مدد دی ہوگی۔ پوری والے نے مجھے مخاطب کیا اور کہا "کیا سوچ رہے ہیں آپ بابو جی۔ گرما گرم پوریاں ہیں"۔ میں نے کہا "بھیا میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جہاں تم بیٹھے ہو۔ یہاں جوتوں کی ایک دکان ہوا کرتی تھی"۔

چوڑی والا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مسکرایا۔" جوتوں کی دکان اب بھی ہے۔ لیکن وہ دس بجے شروع ہوتی ہے اور میری صبح چھ بجے سے شروع ہوتی ہے اور سات آٹھ بجے ختم ہو جاتی ہے۔"

میں آگے بڑھ گیا

کیا دیکھتا ہوں۔ ایک آدمی سڑک پر کانچ کے ٹکڑے بٹور رہا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بھلا آدمی ہے۔ اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ لوگوں کو تکلیف دیں گے۔ اس لئے سڑک پر سے چن رہا ہے۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ پھینکنے کے بجائے وہ بڑی ترتیب سے انہیں اِدھر اُدھر گرا رہا ہے تو میں کچھ دور کھڑا ہو گیا۔

جھولی خالی کرنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے بچھے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی ایک درخت تھا۔ اس پر ایک بورڈ لگا تھا۔" یہاں سائیکلوں کے پنکچر لگائے جاتے ہیں اور ان کی مرمت کی جاتی ہے۔"

میں نے قدم تیز کر دیئے۔

دکانوں کے سائن بورڈوں میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئی۔ پہلے قریب قریب سب انگریزی میں ہوتے تھے۔ اب کچھ دکانوں پر نام اور تحریر دونوں اردو لباس میں نظر آئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔

تحریر خوشخط تھی اور نام بھی جاذبِ نظر تھے۔ مثال کے طور پر آرائش ظاہر ہے کہ دکان میں آرائش سے متعلقہ سامان ہوگا۔ ایک ہوٹل کھلا تھا۔ اس کی پیشانی پر عربی رسم الخط

میں "ماحضر" لکھا تھا۔ آگے چل کر ایک دکان تھی جس کا نام "پاپوش آشیانہ" تھا یعنی جوتوں کا آشیانہ۔ ایک دکان کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا "زمہریر" ضرور قلفیوں کی دکان تھی

میں نے خوش ہو کر پاکستان زندہ باد کہا اور چلتا رہا۔

چلتے چلتے سائیکل کے چار پہیوں پر ایک عجیب وضع کی ہاتھ گاڑی دیکھی۔ پوچھا "یہ کیا ہے"۔ جواب ملا "ہوٹل" ــــ چلتا پھرتا ہوٹل تھا۔ چپاتیاں پکانے کے لئے انگیٹھی اور توا موجود۔ چار سالن تیار۔ شامی کباب تلنے کے لئے فرائی پین حاضر، پانی کے دو گھڑے، برف۔ لیمونیڈ کی بوتلیں۔ دہی کا کونڈا۔ لیموں نچوڑنے کا کھٹکا، گلاس پلیٹیں۔ غرضکہ ہر چیز موجود تھی۔

کچھ دُور آگے بڑھا تو دیکھا ایک آدمی چھوٹے سے لڑکے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا لڑکا نوکر ہے اور اس نے ایک روپے کا نوٹ گُما دیا ہے۔ میں نے اس ظالم کو جھڑکا اور کہا "کیا ہوا بچہ ہے۔ کاغذ کا چھوٹا سا پُرزہ ہی تو ہوتا ہے ایک روپے کا نوٹ۔ کہیں گر پڑا ہوگا۔ خبردار جو تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا

یہ سُن کر وہ آدمی مجھ سے اُلجھ گیا اور کہنے لگا "تمہارے نزدیک ایک روپے کا نوٹ کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہے۔ لیکن جانتے ہو کتنی محنت کے بعد یہ کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ملتا ہے آج کل" ــــ یہ کہہ کر وہ پھر اس بچے کو پیٹنے لگا۔ مجھے بہت ترس آیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکالا اور اس آدمی کو دے کر بچے کی جان چھڑائی۔

چند قدموں ہی کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک آدمی نے میرے کاندھے پر ہاتھ

لکا اور مسکرا کر کہا: "روپیہ دے دیا آپ نے اس خبیث کو؟"

میں نے جواب دیا: "جی ہاں۔ بہت بری طرح پیٹ رہا تھا بیچارے کو۔"

"بیچارہ! اس کا اپنا لڑکا ہے۔"

"کیا کہا؟"

"باپ اور بیٹے دونو کا یہی کاروبار ہے۔ دو چار روپے روزانہ اسی ڈھونگ سے پیدا کر لیتے ہیں۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے" اور قدم بڑھا دیئے۔

ایک دم شور سا برپا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بنڈل لئے چلائے ہیں اور اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے تھے۔ تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں ـــ دہلی میں جوتا چل گیا۔ لکھنؤ میں فلاں لیڈر کی کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا۔ پاکستان کے ایک نجومی کی پیشگوئی۔ کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔

سینکڑوں ہی اخبار تھے۔ آج کا تازہ "نوائے صبح" ـــ آج کا تازہ "ابوالوقت" ـ آج کا تازہ "سنہرا پاکستان"

اخبار فروش لڑکوں کا سیلاب گزر گیا تو ایک عورت نظر آئی۔ عمر یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ۔ سنجیدہ اور متین صورت۔ ایک ہاتھ میں تھیلا تھا۔ دوسرے میں اخباروں کا بنڈل۔ میں نے پوچھا: "کیا آپ اخبار بیچتی ہیں"۔ مختصر جواب ملا: "جی ہاں"۔

میں نے دو اخبار خریدے اور دل میں اس اخبار فروش خاتون کا احترام لئے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں کتوں کا ایک غول کا غول نمودار ہوا۔ بھونک رہے تھے ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ پیار کر رہے تھے اور کاٹ بھی رہے تھے۔ میں ڈر کر ایک طرف ہٹ گیا۔ کیونکہ پندرہ روز ہوئے ایک کتے نے مجھے کاٹ کھایا تھا اور پورے چودہ دس سی سی کے ٹیکے مجھے اپنے پیٹ میں بھنکوانے پڑے تھے۔

میں نے سوچا کیا یہ سب کتے پناہ گیر ہیں یا وہ ہیں جو یہاں سے جانے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ کوئی بھی ہوں۔ ان کا خیال تو رکھنا چاہیئے۔ جو پناہ گیر ہیں۔ ان کو پھر سے آباد کیا جائے اور جو بے آقا ہو گئے ہیں۔ اُن کو ان کی نسل کے اعتبار سے اُن لوگوں کے نام الاٹ کر دیا جائے جن کے کتے اس پار رہ گئے ہیں اور جن کا کوئی والی وارث نہیں۔ اُن کے لئے لکڑی کی ٹانگیں مہیا کی جائیں۔ تاکہ وہ ان ہی سے اپنا شغل پورا کرتے رہیں۔

کتوں کا غول چلا گیا تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے قدم بڑھانے شروع کئے میں نے ایک اخبار کھولا اور اسے دیکھنا شروع کیا۔ سرورق پر ایک فلم ایکٹرس کی تصویر تھی۔ تین رنگوں میں، ایکٹرس کا جسم نیم عریاں تھا۔ نیچے یہ عبارت درج تھی۔

"فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کیسے کیا جاتا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اوپر کی تصویر سے ہو سکتا ہے"۔

میں نے دل ہی دل میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا اور اخبار کو فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔

دوسرا اخبار کھولا۔ ایک چھوٹے سے اشتہار پر نظر پڑی مضمون یہ تھا :۔

"میں نے کل اپنی سائیکل لائلز بنک کے باہر رکھی۔ کام سے فارغ ہو کر جب لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سائیکل پر پرانی گدی کسی ہوئی ہے۔ لیکن نئی غائب ہے۔ میں غریب مہاجر ہوں جس صاحب نے لی ہو براہِ کرم مجھے واپس کردیں۔"

میں خوب ہنسا اور اخبار تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

چند گزوں کے فاصلے پر ایک جلی ہوئی دکان دکھائی دی۔ اس کے اندر ایک آدمی برف کی دو موٹی موٹی سلیں رکھے بیٹھا تھا۔ میں نے دل میں کہا "اس دکان کو آخر کار کسی طرف سے ٹھنڈک پہنچ ہی گئی۔"

دو تین سائیکلیں دیکھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مرد چلا رہے تھے اور ایک ایک برقع پوش عورت پیچھے کیریر پر بیٹھی تھی۔ پانچ چھ منٹ کے بعد ایک اور اسی قسم کی سائیکل نظر آئی۔ لیکن برقع پوش عورت آگے ہینڈل پر بیٹھی تھی۔ دفعتہً خربوزے کے چھلکے پر سے سائیکل پھسلی۔ سوار نے بریک دبائے۔ پھسلنے اور بریک لگنے کے دوہرے عمل سے سائیکل اُلٹ کر گری۔ میں دوڑا مدد کے لئے۔ مرد عورت کے برقع میں لپٹا ہوا اور عورت بیچاری سائیکل کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ میں نے سائیکل ہٹائی اور اس کو سہارا دے کر اٹھایا ۔۔ مرد نے برقع میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھا اور کہا "آپ تشریف

لے جائیے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھا۔ عورت کے سر پر اوندھا سیدھا برقع اٹکایا اور اس کو ہینڈل پر بٹھا۔ یہ جا وُہ جا...... میں نے دل میں دُعا کی کہ آگے سڑک پر خربوزے کا کوئی ادھ چھلکا نہ پڑا ہو۔

تھوڑی ہی دُور دیوار پر ایک اشتہار دیکھا جس کا عنوان بہت ہی معنی خیز تھا "مسلمان عورت اور پردہ"۔

بہت آگے نکل گیا۔ جگہ جانی پہچانی تھی مگر وہ بُت کہاں تھا جو میں دیکھا کرتا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے جو گھاس کے تختے پر استراحت فرما رہا تھا پوچھ "کیوں صاحب یہاں ایک بُت ہوتا تھا وہ کہاں گیا"۔

استراحت فرمانے والے نے آنکھیں کھولیں اور کہا "چلا گیا"۔

"چلا گیا ــــ آپ کا مطلب ہے اپنے آپ چلا گیا؟"

وہ مسکرایا "نہیں اُسے لے گئے"۔

میں نے پوچھا "کون؟"

جواب ملا "جن کا تھا"۔

میں نے دل میں کہا "لو اب بُت بھی ہجرت کرنے لگے ــــ ایک دن وُہ بھی آئے گا۔ جب لوگ اپنے اپنے مردے بھی قبروں سے اکھاڑ کر لے جائیں گے"

یہی سوچتا ہوا قدم اٹھانے والا تھا کہ ایک صاحب نے جو میری ہی طرح ٹہل رہے تھے۔ مجھ سے کہا "بت کہیں گیا نہیں۔ یہیں ہے اور محفوظ ہے"۔

میں نے پوچھا "کہاں؟"

انہوں نے جواب دیا "عجائب گھر میں"۔

میں نے دل میں دعا مانگی "اے خدا وُہ دن نہ لائیو کہ ہم سب عجائب گھر میں رکھے جانے کے قابل ہو جائیں"۔

فٹ پاتھ پر ایک دہلوی مہاجر اپنے صاحبزادے کے ساتھ سیر فرما رہے تھے۔ صاحبزادے نے اُن سے کہا "ابّاجان۔ ہم آج چھولے کھائیں گے"۔

ابّاجان کے کان سُرخ ہو گئے "کیا کہا؟"

برخوردار نے جواب دیا۔ "ہم آج چھولے کھائیں گے"۔

ابّاجان کے کان اور سُرخ ہو گئے "چھولے کیا ہوا، چنے کہو"۔

برخوردار نے بڑی معصومیت سے کہا "نہیں ابّاجان، چنے دلّی میں ہوتے ہیں۔ یہاں سب چھولے ہی کھاتے ہیں"۔ ابّاجان کے کان اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔

میں ٹہلتا ٹہلتا لارنس باغ پہنچ گیا۔ وہی باغ ہمارا پرانا۔ لیکن وہ چہل پہل نہیں تھی۔ صنفِ نازک تو قریب قریب مفقود تھی۔ پھول کھلے ہوئے تھے۔ کلیاں چٹک رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی فضا میں خوشبوئیں تیر رہی تھیں۔ میں نے سوچا۔ عورتوں کو کیا ہوا ہے جو گھر میں قید ہیں۔ ایسا خوبصورت باغ، اتنا سہانا موسم، اس سے لطف اندوز کیوں نہیں ہوتیں ۔ لیکن مجھے فوراً ہی اس سوال کا جواب مل گیا۔ جب میرے کانوں میں ایک نہایت ہی بھونڈے اور سوقیانہ گانے کی آواز آئی ..... اور جب میں نے لارنس باغ کی روشوں پر پھٹی پھٹی نگاہوں والے گوشت کے بے ہنگم لوتھڑوں کو محوِ خرام دیکھا تو مجھے دُکھ ہوا اور اس دُکھ میں اضافہ ہو گیا۔

جب میں نے سوچا کہ پھول بیکار کھل رہے ہیں۔ کلیاں بے مطلب چٹک رہی ہیں۔ یہ جو اُن کی طرف دیکھے بغیر چلے جا رہے ہیں۔ یہ جو اُن کے تعطّر سے بالکل بےخبر ہیں۔ کیا ان کی جگہ اس باغ کے بجائے کوئی ذہنی شفاخانہ نہیں۔ کوئی مدرسہ نہیں۔ جہاں ان کے دماغوں کی بند کھڑکیاں کھولی جائیں۔ ان کی رُوحوں کے زنگ آلود تالے توڑے جائیں۔ اگر کوئی ایسا نہیں کر سکتا میرا مطلب ہے۔ اگر انسان کا ذہن عاجز ہے۔ ان انسانوں کے ذہن کی اصلاح کرنے میں تو کیا وُہ انہیں چڑیا گھر میں نہیں رکھ سکتا جو لارنس گارڈن ہی میں قائم ہے۔

میری طبیعت مکدّر ہو گئی۔ باغ سے باہر نکل رہا تھا کہ ایک صاحب نے پوچھا "کیوں صاحب۔ یہی باغِ جناح ہے؟"

میں نے جواب دیا "جی نہیں۔ یہ لارنس باغ ہے۔"

وہ صاحب مسکرائے "آپ چڑیا گھر سے تشریف لا رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

صاحب ہنس پڑے "قبلہ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے۔ اس کا نام باغِ جناح ہو گیا ہے"

میں نے اُن سے کہا "پاکستان زندہ باد"۔ وُہ اور زیادہ ہنستے ہوئے لارنس باغ میں چلے گئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں دوزخ سے باہر نکلا ہوں ؎

حقّا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردئ ہمسایہ در بہشت

یومِ اقبال پر

۔۔۔ معزز حاضرین اور میرے ہم قلم رفیقو — !

یومِ اقبال کی اس پہلی نشست کی صدارت کا اعزاز جو آپ نے مجھے بخشا ہے رسماً مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ لیکن بندہ صرف گزشتہ رسوم و قیود نہیں۔ صدارت کی کرسی کی طرف دیکھ کر البتہ ایک اُلجھن سی ضرور ہوتی ہے۔ اتنی دیر گالیاں اور سٹھنیاں کھاتا رہا اور آج ۔۔۔ لیکن علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ کیا ہوا تھا — اپنے زمانے میں لعن طعن کے علاوہ ان کو تو الحاد اور کفر کے فتووں سے بھی دو چار ہونا پڑا تھا — ایسا سوچنے پر یہ الجھن تو کسی حد تک دور ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک دوسری اُلجھن جو اس وقت مجھے محسوس ہوتی ہے۔ یہ ہے کہ شاعری سے مجھے اتنا ہی شغف ہے۔ جتنا مہاتما گاندھی کو فلموں سے تھا۔ بہرحال مجھے اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو آپ حضرات نے مجھے دیا ہے۔

اقبال کے کلام سے میرا سب سے پہلا تعارف ہوٹل کے بل سے ہوا۔ آج سے تقریباً پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ زندگی سے قطعاً مایوس ہو کر میں فرار کے طور پر کھل کھیل رہا تھا۔ ایک رات۔ غم غلط کرنے کے سامان کے دام چکانے لگا تو بل کی پرچی کی پشت پر فارسی کا یہ مصرعہ نظر آیا ؎

اگر خواہی حیات۔ اندر خطر زی

کسی ہم مشرب کی بروقت نصیحت تھی۔ یا پیرِ مغاں کی شفقت — آج یہ عالم ہے کہ زندگی چاہے مجھ سے مایوس ہو جائے۔ میں اس سے مایوس ہونے کا کبھی نام نہیں لیتا — مہنگے سے مہنگے داموں پر خطرے مول لیتا ہوں اور اونے پونے داموں بیچ دیتا ہوں — لیکن خدا گواہ ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔

اقبال کے کلام سے مزید تعارف بھی اسی زمانے میں ہوا۔ ایک کتب فروش نے مجھے ڈرتے ڈرتے "بالِ جبریل" دکھائی اور سب سے پہلے وہ نظم پڑھنے کے لئے کہا جس کا عنوان شاید فرمانِ خدا ہے۔ ہم دونوں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ یک زبان ہو کر پڑھا ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

ان دنوں اقبال کو بالشویک یعنی روس کا ایجنٹ سمجھا جاتا تھا۔ آج جبکہ یہاں آزاد اسلامی حکومت قائم ہے۔ خدا کا یہی فرمان دہرانے والے کمیونسٹ کہلاتے ہیں اور

ان کے سر پر قانون کا عتاب بند لاتا رہتا ہے۔ لیکن خدا کا اتنا شکر ہے کہ اقبال کا کلام اس قسم کے احتساب سے آج کل محفوظ ہے۔

پچھلے دنوں یہ خبر سننے میں آئی کہ مغربی پنجاب کے ایک گاؤں میں مہاجر کسانوں نے اناج کے ایک بہت بڑے ذخیرے کو آگ لگا دی۔ اس لئے کہ جاگیرداروں نے رات ہی رات اسے چرا کر اپنے گوداموں میں بھر لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ ضروری نہیں کہ مخلص آرٹسٹ کا پیغام کتابوں، تصویروں اور آوازوں ہی سے لوگوں تک پہنچے۔ جب کوئی آرٹسٹ سازِ زندگی کے کسی تار کو چھیڑتا ہے تو اس کی لرزش کی گونج صدیوں تک فضاؤں میں تیرتی رہتی ہے اور بعض اوقات خود بخود دل کے ان تاروں تک پہنچ جاتی ہے جو اذیت دینے والے ہاتھوں نے جھنجھوڑے ہوتے ہیں۔ ورنہ ان اَن پڑھ مہاجر کسانوں کو کیا معلوم تھا۔ کہ بالِ جبریل میں آج سے بہت پہلے اقبال لکھ گیا تھا ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال کے کلام اور اس کے فلسفے کی باریکیاں بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں اس مجلس میں ایسے اصحاب موجود ہیں جو اس باوقار اور پرعظمت شاعر کے اس پیغام ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے

یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ

کی تشریح بطریقِ احسن کر سکتے ہیں۔

مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ لیکن دو دُکھ ہیں۔ جن کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک دُکھ اس وقت ہوا۔ جب اقبال جیسے غیور شاعر کو بے حقیقت بادشاہوں کے قصیدے لکھنا پڑے۔ ایک دکھ مجھے اب ہو رہا ہے جب میں رموزِ بیخودی میں آسمانوں، زمینوں ہواؤں۔ دریاؤں۔ پہاڑوں اور وادیوں، سورج چاند اور ستاروں، پھلوں اور پھولو غرضکہ ساری کائنات کو انسان کی میراث قرار دینے والے شاعر کے قلندرانہ کلام پر چند خود غرض مجاوروں کا قبضہ دیکھتا ہوں۔

ہمارے یہاں مقبروں کی مجاوری عام ہے۔ لیکن اقبال کا کلام تو زندہ کلام ہے اس پر مجاور بن کر بیٹھنا اور کچھ نہیں تو خلافِ دستور ضرور ہے۔

اقبال نے خدا کے حضور دعا مانگی تھی ــــ مرا نورِ بصیرت عام کر دے ــــ یہ دعا جو ایک درد مند دل سے نکلی ضرور قبول ہوگی۔ لیکن صابنوں، تیلوں اور ہوٹلوں اور لانڈریوں کے ساتھ اس شاعرِ اعظم کا نام منسوب ہوتے دیکھ کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نورِ بصیرت بہت دیر تک جہالت کی تنگ اور اندھیری گلیوں میں بھٹکتا رہے گا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

محبوس عورتیں

تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد اس قدر مجلسی و معاشرتی مسائل پیدا ہوئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ یوں تو ہر شخص انہیں سلجھانے کی کوشش میں ہمہ تن معروف ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شور زیادہ ہے اور کام بہت ہی کم ہو رہا ہے۔

برطانوی سامراج کی حکمت عملی نے وہ شاطرانہ چال چلی کہ ٹھنڈے دماغوں کو بھی سوچنے کا موقع نہ ملا۔ ہندوستان کو اس چابک دست جرّاح نے پتھر کی سرد سلوں پر لٹا کر چیرا پھاڑا۔ ایک سنگین سکون و اطمینان کے ساتھ اس کے حصے بخرے کئے اور یہ جا وہ جا۔ اور وہ جن کے تدبّر، وہ جن کی دقیقہ رسی، وہ جن کی شاہین نگاہی کی سارے عالم میں دھوم تھی۔ آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

پچھلے چند مہینوں میں اس سرزمین پر جس کا نام کبھی ہندوستان تھا۔ خون کے وہ دریا بہے کہ جس پر چشم فلک بھی حیران ہے۔ نار کو بادۂ ہر جام بنایا گیا۔ دوسری اخلاص نایاب

مگر انسانی گوشت پوست کی دکانیں عام کھُلی تھیں۔ ہر بازار میں ایک عام مَنگی نصیب تھی۔ ہر چوک میں ایک مقتل تھا۔ چنگیز اور ہلاکو۔ امیر تیمور گورگانی۔ نادر شاہ درّانی اور بہیمیت و بربریت کا تازہ ترین علمبردار اڈولف ہٹلر بھی اگر ان خونیں مناظر کو دیکھتا تو یقیناً خود کو ناچیز سمجھتا۔ لہو اور لوہا۔ جنگ اور تفنگ انسان کی تاریخ میں کوئی نئی چیزیں نہیں۔ اولادِ آدم ان کھیلوں میں ہمیشہ دلچسپی لیتی رہی ہے مگر وہ کھیل جو پچھلے دنوں کھیلا جاتا رہا ہے۔ اُس کی مثال ابنِ آدم کے رنگین فسانے میں کہیں بھی نہیں ملتی۔

خود کو حیوانوں سے کچھ اُونچا رکھنے کے لئے انسان نے قتل وغارت گری کے لئے بھی کچھ آداب و قواعد بنا رکھے ہیں۔ لیکن جس قتل وغارت گری کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ اِن آداب و قواعد سے بے نیاز تھی بلکہ یوں کہئے کہ حیوانیت سے بھی یکسر معرّا تھی۔ جس کی تصویر شاید یہ قتل وغارت گری خود بھی نہ کھینچ سکے۔

اس وقت ہماری نظروں کے سامنے خون کی سُوکھی ہُوئی پٹریاں کٹے ہوئے اعضاء جھلسے ہوئے چہرے۔ رندھے ہوئے گلے۔ ٹھٹھری ہُوئی جانیں، لٹے ہوئے مکان جلے ہوئے کھیت، ملبے کے ڈھیر اور بھرے ہوئے ہسپتال ہیں۔ ہم آزاد ہیں۔ ہندوستان آزاد ہے، پاکستان آزاد ہے اور ہم گرسنگی و برہنگی، بے سروسامانی و بے حالی کی ویران سڑکوں پر چل پھر رہے ہیں۔

گندم نہیں ہے۔ روٹی نہیں ہے۔ چاول نہیں ہے۔ گرانی ہے، قحط ہے، بیماریوں کی یلغار ہے۔ سردیوں میں آگ نہیں۔ گرمیوں میں پانی نہیں۔ زمینیں سکڑ گئی ہیں

آسمان سمٹ گئے ہیں۔ تدبیر کے گھسے ہوئے ناخن یہ پیچیدہ گرہیں کھولنے میں مصروف ہیں اور ہم محوِ تماشا ہیں۔

ٹھنڈی زمینوں پر لیٹی ہوئی ماؤں کی چھاتیوں میں دُودھ کے آخری قطرے منجمد ہوئے ہیں۔ قدرت کا بے رحم ہاتھ بچوں کو اُن کے آخری اثاثے سے محروم کر رہا ہے لیکن ایسی حویلیاں بھی ہیں۔ جہاں ننھے کا بچا ہوُا دودھ موریوں میں بہایا جاتا ہے۔ لاکھوں ستم رسیدہ تن کے لئے ایک چیتھڑے کو ترس رہے ہیں۔ لیکن وُہ بھی ہیں جو فیشن کی نوک پلک درست رکھنے کے لئے طرح طرح کے ملبوسات سے اپنی الماریاں سجائے بیٹھے ہیں۔

یہ تماشا کب تک جاری رہے گا۔ کب تک مظلوم انسانیت کپڑے کے پھٹے ہوُئے خیموں میں قید رہے گی۔ کب تک مجبور نسوانیت تحفظ کی نام نہاد چار دیواری میں شہوانیت کی شکار ہوتی رہے گی۔ کب تک غربت و بے چارگی سرمائے کے ہاتھوں فروخت ہوتی رہے گی ___ کب تک؟

ہماری بٹی ہوئی تہذیب ہمارا تقسیم شدہ تمدّن۔ ہمارا اُجڑا ہوُا فن۔ ہر وہ چیز جو ہمارے ہی جسم سے کٹ کر ہمیں ملی ہے۔ مغربی سیاست کے بھوبل میں دفن ہے۔ ہمیں ان سب کو نکالنا ہے۔ جھاڑنا پونچھنا ہے۔ ترو تازگی بخشنا ہے اور اس طوفان میں جس جس شے سے ہم محروم ہوئے ہیں۔ اسے دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ لیکن سب سے پہلے ہمیں اُن زخموں کی دیکھ بھال کرنا ہے جو ذرا سی غفلت پر ناسور بن جانے والے

ہیں سب سے بڑا اور گھناؤنا زخم اُن عورتوں کا وجود ہے جن میں سے کچھ ہماری بُزدلی کے باعث بے لگام شہوانیت کا شکار ہوئیں اور کچھ مخالفین کی "شہ زوری" کا نشانہ مشق بنیں۔ کہا جاتا ہے۔ ایسی پچاس ہزار عورتیں موجود ہیں۔ مائیں، بہنیں اور بچیاں۔ ان میں سے چند ہزار کی بازیابی ہو چکی ہے۔ جو باقی ہیں۔ ابھی تک شہوت کے تنوروں میں ایندھن کا کام دے رہی ہیں۔

پچھلے دنوں قائدین ملت کی ایما پر ان مظلوم و مقہور عورتوں کی بازیابی کی مہم بڑے زور شور سے شروع ہوئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمیں اس کا اتنا زیادہ گلہ نہیں۔ اس لئے کہ اس مہم کا انحصار زیادہ تر فریق ثانی کے دل پگھلنے پر تھا۔ لیکن اس بات کی شکایت ہمیں ضرور ہے کہ ان عورتوں کے متعلق جو ہمیں واپس مل چکی ہیں۔ نفسیات کی روشنی میں بہت کم غور کیا گیا ہے۔ ان گھائل روحوں کے لئے کسی جیل میں ایک وارڈ مخصوص کر دینے سے اور تفریح کے لئے وہاں ایک عدد ریڈیو سیٹ لگا دینے سے یا کسی خوش پوش لیڈر زادی کے معائنے سے ان کی تقدیر کی رفوگری نہیں ہو سکتی اور پھر ان کے تاریک مستقبل کو روشن بنانے کیلئے یہ بھی کوئی حل نہیں کہ ان کو سپاہیانہ تعلیم دے کر "فوجی گوروں" کی تانیث بنا دیا جائے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے اس نشان کو مٹانے کی کوشش کی جائے جو ان تقدیر کی بیٹیوں کی پیشانی پر حادثات کی سیاہی لگا گئی ہے اور اس کے بعد ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے لئے اپنی معاشرت میں صحت افزا جگہ پیدا کی جائے۔

یہ عورتیں غریب ہوں یا امیر۔ کنواری ہوں یا بیاہی ہوئی۔ مال گاڑی کا نقصان رسیدہ اسباب نہیں جو انہیں کچھ دن گودام میں رکھ کر نیلام پر چڑھا دیا جائے اور اگر کچھ مصرف سمجھ میں نہ آئے تو انہیں تلف کر دیا جائے۔

ہزاروں عورتوں کا سوال ہے جو کبھی ماؤں کی بیٹیاں۔ بھائیوں کی بہنیں۔ اور شوہروں کی بیویاں تھیں۔ جس حالت میں یہ اب ہیں، اُس کی ذمہ دار سیاست کی اکھاڑے بازی ہے۔ مذہب کا وہ جنون ہے جس کی مثال انسانوں کی پچھلی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی اور کچھ نہیں تو ان عورتوں کے وجود کو اپنا ہی گناہ سمجھ کر ہمیں پردہ پوشی کرنی چاہیئے۔

اگر فوری طور پر کچھ نہ کیا گیا تو ان عورتوں کا شکستہ حال ایک بہت ہی خوفناک خرابی میں تبدیل ہونے والا ہے سینکڑوں بلکہ ہزاروں قحبہ خانے مُنہ کھولے ان کے استقبال کیلئے تیار ہیں ہمیں اسکے تصور ہی سے کانپ جانا چاہئے اور پھر وُہ بچے ہیں جو کئی عورتوں نے اپنی مجبور کوکھ سے پیدا کئے ہیں۔ اس خودرو پود کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کون ہے۔ کون ہوگا اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ آپ کو سوچنا ہے۔ یہ مجھے سوچنا ہے۔ یہ ہمارے اُن رہنماؤں کو سوچنا ہے جو اس سرزمین کے خاوند ہیں اور سب سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ وُہ لوگ صرف سوچنے کی خاطر سوچتے ہیں عملی زندگی میں ان کا کیا مصرف ہے؟ یہ مسائل ایسے ہیں کہ ان پر فوری تدبّر اور عمل کی ضرورت ہے۔ کرسی نشین فکر و عمل اور تن آسان تدبر و تنظیم سے ہمارے خلیجی اثرے کا یہ چاک ہرگز ہرگز رفو نہ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ملک کے تمام ماہرین نفسیات مل کر ان مظلوم عورتوں اور ان کی جبری اولاد کے لئے زندگی میں ایک صاف اور ہموار راستہ تلاش کریں تاکہ یہ سماج کے جذباتی قوانین کی ٹھوکروں سے بچے رہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور یہ نازک مسئلہ اناڑیوں کے سپرد رہا تو اندیشہ ہے کہ حالات نازک سے تاریک تر ہو جائیں گے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اخباروں میں ان عورتوں کے فوٹو شائع کرنے سے کس قسم کا اثر پیدا کرنا مقصود ہے۔ دیکھنے والے ان کے چہروں کی مصنوعی مسکراہٹیں ضرور دیکھتے ہیں۔ لیکن سمجھنے والے بخوبی سمجھتے ہیں کہ یہ کاغذ ان کی آنکھوں کے وہ آنسو جو کہ وہ بہا چکی ہیں اور جو آئندہ بہانے والی ہیں ہرگز خشک نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ ان عورتوں کے وجود کی ایسی طلبیانہ تشہیر غایت درجہ قابل اعتراض ہے۔ افسوس ہے کہ جو کام ہمیں خاموشی، سنجیدگی اور متانت سے کرنا چاہئے تھا اس میں غیر ضروری بلند آہنگی برتی جا رہی ہے۔ یہ سراسر بھونڈا پن ہے جو حقیقت ہے اور ایک بہت ہی تلخ حقیقت ہے۔ ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے۔ یہ تلخ حقیقت انسانیت کی اس ذلت آفریں اُفتاد کے سوا اور کیا ہے جس نے ان معصوم عورتوں سے ایسا گھناؤنا سلوک کیا۔ ہمیں رجائی بن کر اسی انسانیت سے رجوع کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنے پہنچائے ہوئے نقصان کی تلافی کر سکے۔ انسانیت کا گناہ سب انسانوں کا گناہ ہے۔ وہ عظیم ترین گناہ جو چند گمراہ انسانوں سے سرزد ہو چکا ہے۔ آئیے ہم سب مل کر اس کا کفارہ ادا کریں کہ اسی میں ہماری ان عورتوں کی، ان کے بچوں کی، پاکستان کی اور ہندوستان کی بھی نجات مضمر ہے۔

ہم جانور پال سکتے ہیں۔ چھوتوں کو اپنے سینے سے لگا سکتے ہیں۔ کیا ہم ان عورتوں اور ان کے بچوں کو اپنے گھر میں جگہ نہیں دے سکتے؟ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب سب سے پہلے ہمارے رہنماؤں کو دینا چاہئے۔ تاکہ عوام کو جو تقلید کے عادی ہیں۔ اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کا موقع ملے۔

ایمان وایقان

یو-این-او-ریڈیو

ہم کامیابی کی جھیل کی گہرائیوں سے بول رہے ہیں۔امن پسند لوگ یہ سُنکر خوش ہوں گے کہ روس اور امریکہ کے تنازعے کا خاطر خواہ فیصلہ ہوگیا ہے طے پایا ہے کہ ان دونوں حکومتوں کی ایٹمی طاقت کی اوپن ائیر نمائش ہو۔اس دنگل میں جس کے دم خم دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔دُنیا کی باگ ڈور تھامنے کا اہل قرار دیا جائے گا۔چار بڑی طاقتوں نے اپنے اپنے منصف اس دنگل میں حِصّہ لینے کے لئے بذریعہ جیٹ پروپلڈ ہوائی جہاز روانہ کر دیئے ہیں۔قوی امید ہے کہ دُنیا کے اس سب سے بڑے سیاسی تنازعے کا فیصلہ دوستانہ فضا میں بطریقِ احسن ہو جائے گا۔

یو-ایس-اے-ریڈیو

ہم چار بڑی آزادیوں کی کوکھ سے بول رہے ہیں۔کامیابی کی جھیل کی گہرائیوں

ہیں ہمارے اور روس کے تنازعے کا جو فیصلہ ہوا ہے۔ اس وقت تک کامیاب نہیں کہا جا سکتا جب تک ایٹمی طاقت دریافت کرنے کے معاملے میں فریقِ ثانی ہمیں مجتہد تسلیم نہ کرے۔ ہم دنگل لڑنے کے لئے بسر و چشم ہیں لیکن اکھاڑے میں پہلے ہمارا مدِ مقابل ہمیں اپنا استاد تسلیم کرے۔

یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ ریڈیو

ہم ہتھوڑے اور درانتی کی آواز کے ساتھ بول رہے ہیں۔ فریقِ ثانی کے بلند بانگ دعاوی ہم سُن چکے ہیں۔ پدرم سلطان بود کا زمانہ لد گیا۔ امریکہ کو کلمبس نے دریافت کیا تھا لیکن اس غریب کے فلک کو بھی ایٹمی طاقت کا علم نہیں تھا۔ ہم اس میدان میں طفلِ مکتب ہی سہی لیکن پنجہ ڈال کر دیکھ لیا جائے کہ طاقتور کون ہے۔

یو۔ این۔ او۔ ریڈیو

ہم کامیابی کی جھیل میں خوشی کے گیت گاتے اور ڈبکیاں لگاتے ہوئے بول رہے ہیں۔ ہمارے خوشی کے گیت کے پہلے بول یہ ہیں کہ روس اور امریکہ نے ایک دوسرے کو چند سیاسی سٹھنیاں دینے کے بعد یورینیم اور پلوٹینیم پر ہاتھ رکھ کر صاف دنگل لڑنے کا حلف اٹھا لیا ہے ؎

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

یو۔ایس۔ایس۔آر۔ریڈیو

یورنیم اور پلوٹونیم پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا احترام کریں۔ چنانچہ بین الاقوامی قواعد و ضوابط کے پیشِ نظر مسابقت کے دنگل میں حصہ لینے سے پہلے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ نمونے کے طور پر ایک ایٹم بم امریکہ روانہ کر دیں۔ تاکہ وہاں کے ماہرین اچھی طرح ٹھونک بجا کر اس کی طاقت کا اندازہ کر لیں جس سے ہمارے دعووں کا جھوٹ سچ ان پر واضح ہو جائے گا۔ نمونے کے اس ایٹم بم کی روانگی کے وقت کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

یو۔ایس۔اے۔ریڈیو

اجتہاد اور پہل ہمیشہ ہمارا حصّہ رہا ہے۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ ایٹم بم کا نمونہ پہلے یہیں سے روانہ کیا جائے۔ چنانچہ چار بڑی آزادیوں کے نقارے پر چوٹ لگا کر اس کا اعلان کیا جاتا ہے کہ آج چار بج کر سوا چھیالیس منٹ، گرین وچ ٹائم پر چچا سام اپنے بہترین اور خوبصورت ترین ایٹم بم کا نمونہ روس کے ماہرین کی جانچ پڑتال کے لئے روانہ کر دیں گے۔

یو۔ایس۔ایس۔آر۔ریڈیو

(ہوم سروس) امریکہ سے ایٹم بم کی روانگی پر متحدہ جمہوریہ روس میں جو خوف و ہراس

کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مگر خ فائدین کے نزدیک بہت ہی شرمناک ہے۔ ہمارے سائنسدان جو ایٹم کی رگ رگ اور نخ نخ سے واقف ہیں۔ اس کے استقبال کے لئے چشم براہ ہیں۔

یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ ریڈیو

درانتی اور ہتھوڑے کی مار اور کاٹ کا فیصلہ آج ہو جائے گا۔ ہم نے بھی آج چار بج کر سوا چھیالیس منٹ، گرین وچ ٹائم پر اپنا بُرا بھلا ایٹم بم نمونے کے طور پر امریکہ کے ماہرین کی خدمت میں روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ بم ۵۰۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے مسافت طے کرے گا۔

یو۔ ایس۔ اے۔ ریڈیو

(ہوم سروس) ہمارے سائنس دانوں نے عظیم ترین دوربینوں کے ذریعے سے روس کے بھیجے ہوئے ایٹم بم کا معائنہ کر لیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ وہ اسے واپس بھیجنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لئے لوگوں کو بے وجہ مضطرب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

یو۔ ایس۔ اے۔ ریڈیو

ہمارا بھیجا ہوا نمونے کا ایٹم بم اُس بم سے دس ہزار گنا بڑا ہے۔ جو ہم نے

ہیروشیما پر گرایا تھا۔ اُمید ہے۔ روس کے ماہرین نے اب تک اس کا اندازہ کر لیا ہوگا۔ جو ایٹم بم روس نے ہماری طرف روانہ کیا ہے۔ اسکے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا

یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ ریڈیو

قد و قامت اور ڈیل ڈول کی طرف از منۂ عتیق کے لوگ دیکھتے تھے۔ عہد جدید میں اس پرانے گز سے کسی کی طاقت ماپنا از حد مضحکہ خیز ہے۔ امریکہ کے ایٹم بم کی حقیقت ہمارے سائنسدانوں نے دُور ہی سے دیکھ کر معلوم کر لی ہے اور وہ گر بھی اپنے محلوں میں تلاش کر لیا ہے جس سے امریکہ کی یہ سوغات شکریئے کے ساتھ لوٹائی جا سکے گی۔

یو۔ ایس۔ اے۔ ریڈیو

ہماری تیاریوں میں صرف ایک آنچ کی کسر تھی۔ مگر اب ہم بصد فخر و ابتہاج یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے قابل سائنسدانوں نے روس کے ایٹم بم کو عین جبکہ وہ ہماری سرحدوں میں داخل ہونے والا تھا۔ کومک ربڑ کے زور سے دھکا دے کر واپس روس بھیجدیا ہے۔

یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ ریڈیو

ہم نے امریکہ کے ایٹم بم کو ایسا ریلا دیا ہے کہ پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے

آنے کے بدلے اب یہ سات سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے واپس جا رہا ہے۔ لیکن اس کے برعکس ہمارا ایٹم بم بہت ہی سست رفتاری سے ہمارے پاس واپس آ رہا ہے۔

یو۔ ایس۔ اے۔ ریڈیو

رفتار تیز اور سست کرنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ حکم دے دیا گیا ہے کہ روسی ایٹم بم کی واپسی کی رفتار سات سو میل فی گھنٹہ کر دی جائے۔۔

یو۔ این۔ او۔ ریڈیو

ہم کامیابی کی جھیل کی نیلاہٹوں سے بول رہے ہیں اور دنیا کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ ہم نے دنگل کا موقع ہی نہیں آنے دیا اور روس اور امریکہ کی ایٹمی طاقتوں کو برابر چھڑا دیا ہے۔ وہ دو ایٹم بم جو طرفین نے نمونے کے طور پر ایک دوسرے کو بھیجے اور واپس کئے تھے۔ ابھی تک فضاؤں کو چیر رہے ہیں۔ لیکن سیکیورٹی کونسل کی سفارش پر خیر سگالی کے اشارے کے طور پر دونوں طاقتیں ان بموں کا رخ کسی اور طرف پھیر دیں گی۔

اے۔ آئی۔ ریڈیو

آج بھور سمے پچھم سے ایک بہت بڑا بھیانک پونچھ والا تارا آکاش پر نکلا

اور آن کی آن میں ہمارے سروں پر آکر لٹک گیا۔ جنتا میں اس کارن بہت ڈر اور بے اُپتن ہو گیا ہے۔

اے۔ پی۔ ریڈیو

دمدار سیارہ جس کے طلوع ہونے کی خبر اس سے پیشتر نشر کی جا چکی ہے، فضاؤں میں اُسی طرح معلق ہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف آرہا ہے۔ حکومت نے اس کے بارے میں معتبر رپورٹ تیار کرانے کے لئے اسکولوں کے تمام ہوشیار سائنس ماسٹروں اور کالجوں کے تمام لائق پروفیسروں کی ایک جماعت تیار کی ہے۔ امید ہے کہ بہت جلد اس دمدار سیارے کی وجہِ نمود معلوم ہو جائے گی۔

اے۔ آئی۔ ریڈیو

آکاش پر پونچھ والے تارے کے پرگٹ ہونے سے جنتا میں بھے اور بھی اُدھک ہو گیا ہے۔ پرنتو بھارت سرکار کے رکھشا منتری نے جنتا کو آشواسن دلایا ہے۔ کہ اس بھینکر گرہ کو ٹالنے کی یوجنائیں سوچی جا رہی ہیں۔ بڑے بڑے پنڈتوں اور اچاریوں کو اس کٹھنائی کا بھید جاننے پر لگا دیا گیا ہے۔

اے۔ پی۔ ریڈیو

سکول کے ماسٹروں اور کالج کے پروفیسروں نے سائنس کی ساری کتابیں چھان

ماری ہیں مگر انہیں اس دمدار ستارے کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ جواب زمین کی طرف پہلے کی بہ نسبت اور زیادہ سست رفتاری سے نیچے اتر رہا ہے۔ علماء دین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ "قہر خدا ہے جو ہم پر نازل کیا گیا ہے" چنانچہ عوام سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس بلا کو ٹالنے کے لئے خدائے عزوجل ہی سے رجوع کریں۔ طے پایا ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے بڑے بڑے میدانوں میں لوگ جمع ہوں اور ننگے سر دعا مانگیں۔

اے۔ آئی۔ ریڈیو

جن پنڈتوں اور اچاریوں کو پوچھ والے ستارے کے بھید کی کھوج پر "لگایا گیا تھا۔ اس پری نام پر پہنچے ہیں کہ مانو گیان اس ستارے کے رس کو جاننے میں اسمرتھ ہے۔ پراچین رشیوں کی نیتی کے انوسار بھارت سرکار نے نشچے کیا ہے کہ کورو کھشیتر کے اتہاسک میدان میں ایک مہان یگ رچایا جائے۔ اس یگ میں ویدوں کے دھرندر پنڈت تتھا ودوان سملت ہوں گے۔ ایک مہان ہون کے لئے سامگری اکٹھی کی جا رہی ہے۔ میسور کے سارے چندن کے بن کٹوا کر یگ استھان پر لائے جا رہے ہیں۔ ایک دانی ویر نے ایک لاکھ ٹن شدھ گھی کے پرتی دن دینے کا پرن کیا ہے۔ سادھوؤں تتھا یاتریوں کے بھوجن آدی پر دس کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ پورن آشا ہے کہ مہا پربھو پرمیشور کی اپار دیا سے یہ کٹھن گھڑی ٹل جائے گی۔

اے ۔ پی ۔ ریڈیو

میدانوں میں ننگے سر اجتماعی دعائیں مانگنے ۔ دس کروڑ کالے بکروں کی قربانی دینے اور تمام اولیائے کرام کے مزاروں پر نذر نیاز اور چادریں چڑھانے کے ساتھ ساتھ حفظِ ماتقدم کے طور پر زمین میں جگہ جگہ سرنگیں اور گڑھے کھودنے کا کام بھی جاری ہے اگر خدانخواستہ دمدار سیارہ نیچے آرہا تو یہ سرنگیں اور گڑھے خاطر خواہ بچاؤ کی صورت پیدا کر دیں گے ۔

اے ۔ آئی ۔ ریڈیو

یہاں یگ سپھلتا پوروک ہو رہا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی بھارت سرکار کے رکھشا منتری نے جنتا کے بچاؤ کے لئے بیس کروڑ آدمیوں کی ایک بھاری سینا کو ایک سرنگ کھودنے پر لگا دیا ہے جو پاتال تک جائے گی ۔ اوشکتا پڑنے پر یہ سرنگ سب نر ناریوں کے لئے رکھشا استھان کا کام دے گی ۔

ایس ۔ ایچ ۔ ریڈیو

ہم ساتویں آسمان سے بول رہے ہیں ۔ پیغمبروں سے اطلاع وصول ہوئی ہے کہ وہاں دو بہشتوں میں بڑے خضوع و خشوع سے دعائیں مانگی جارہی ہیں کہ خدا ان کو انسان کے اپنے بنائے ہوئے تباہ کن بموں سے نجات دلائے ۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ اس کی ذات رحیم و کریم ہے اور اس کے حضور صدق دل سے مانگی ہوئی دعا کبھی خالی نہیں جاتی۔ لیکن بستیوں کی ان دو بستیوں کے باشندوں کے ایمان و ایقان کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ حفاظت کے لئے ایک ہاتھ دعا کے لئے آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے زمین میں گڑھے اور سرنگیں کھودتے ہیں۔

پردے کی باتیں

پردہ اُٹھتا ہے

بازار میں ایک آدمی اسٹول پر کھڑا ہے۔ منہ سے بھونپو لگائے اور ہاتھ میں بہت بڑی قینچی پکڑے چلا رہا ہے "اگر میں نے کسی مسلمان عورت کو اس بازار میں بے پردہ گذرتے دیکھا تو اس قینچی سے اس کی چُٹیا کاٹ دوں گا"۔

درزی کی دکان میں دھڑا دھڑ برقعے سئے جا رہے ہیں۔ کام کے ساتھ ساتھ باتیں بھی جاری ہیں۔

"یار جناح صاحب کی ہمشیرہ کیوں پردہ نہیں کرتیں"۔

"معلوم نہیں"۔

"وزیراعظم صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں۔ وہ بھی ننگے مُنہ پھرتی ہیں"۔

"امیر آدمیوں کو پردے کی ضرورت ہی کیا ہے"۔

"کسی مولوی سے پوچھنا چاہیئے"۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

کالج میں مباحثہ ہو رہا ہے۔

لڑکی جذبات بھری آواز میں کہتی ہے "صرف عورتوں کے حقوق دبانے کی خاطر اور انہیں معاشرتی سرگرمیوں سے دُور رکھنے کے لئے مرد اُن پر پردہ عائد کرنا چاہتے ہیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے مسلمان عورتیں مردوں کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لیتی رہی ہیں . . . . پردہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ بہت بڑا ظلم ہے۔ وہ لوگ جو اس کے حامی ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھیں — پچاس ہزار عورتیں جو مشرقی پنجاب میں رہ گئی ہیں کیا ان کی تباہی کا باعث یہ زبردستی عائد کیا ہوا پردہ نہیں ہے"۔

لڑکا میز پر مکہ مار کر کہتا ہے "خدا کی قسم میں پردے کا بالکل حامی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ لعنت حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ لیکن صرف بحث کی خاطر مجھے بڑے زور سے کہنا پڑتا ہے کہ پردہ عورت کے لئے اشد ضروری ہے۔ اگر عورتیں بے پردہ چلیں پھریں گی تو نظام معاشرت بالکل درہم برہم ہو جائے گا۔ فاسد خیالات کا دور دورہ ہوگا اور مرد بالکل حیوان بن جائیں گے — عورتوں کو صرف اسی خوف سے کہ مرد کہیں حیوان نہ بن جائیں۔ فوراً پردہ اختیار کر لینا چاہیئے"۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

گلی میں چھوٹے چھوٹے بچے اور چھوٹی چھوٹی بچیاں کھیل رہی ہیں۔ ایک بچہ دفعتہً ایک بچی سے کہتا ہے "تمہیں شرم نہیں آتی ننگی پھر رہی ہو۔ جاؤ برقع پہن کر آؤ"۔ بچی جواب دیتی ہے "میں برقع نہیں پہنتی۔ لیکن تم ننگے پاؤں کیوں پھرتے ہو"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

کافی ہاؤس میں ایک لمبے لمبے بالوں والا آدمی اپنے دوستوں سے کہہ رہا ہے "پردہ لایعنی ہے۔ پردہ ہوتا ہے جہالت کا۔ پردہ ہوتا ہے غفلت کا، راز کا، گمنامی کا۔ عورت جہالت نہیں، غفلت نہیں، راز نہیں، گمنامی نہیں — پھر اس کا پردہ کیا؟"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

بھٹیار خانے میں ایک داڑھی والا سامعین سے کہہ رہا ہے :۔

"بحکم بصیغہ امر تو یہ ہے کہ عورت اپنی زینت چھپائے۔ استثنیٰ بصیغہ امر نہیں ہے کہ فلاں حصہ جسم کو چھپایا جائے۔ استثنیٰ کے الفاظ ہیں "الا ما ظہر منھا" صرف اس بات کا ہے کہ اگر زینت کا کوئی جزو اتفاقی طور پر یا مجبوری سے ظاہر ہو جائے گا۔ تو اس پر گرفت نہیں۔ اگر جسم یا آرائش کے کسی خاص حصے کو ظاہر کرنا عام طور پر جائز کرنا مقصود ہوتا تو آیت میں کہا جاتا کہ اپنی زینت کو چھپاؤ، بجز فلاں فلاں چیز کے — الا ما ظہر منھا" سے یہ مراد لینا کہ منہ اور ہاتھ کھلے رکھے جائیں صحیح نہیں۔ اس لئے کہ غیر ارادی طور پر اس سے بھی زیادہ حصہ جسم کا ظاہر ہو جانا قابل گرفت نہ ہوگا اور مجبوری نہ ہو تو سارے جسم کو چھپانا عورت کے لئے ضروری ہے"۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

دیہات میں ایک جاٹ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے "۔ نیک بختے"۔ ایہہ چوّدر چھڈ بُرقعہ بنّڑ دا۔ اوجیہڑا تنبو وانگ ہُندا اے"۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

ایک آدمی اپنے خواندہ دوست سے خط لکھوا رہا ہے :۔

"جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

الحمدللہ، پاکستان قائم ہو چکا ہے اور شریعت اسلامی نافذ ہو چکی ہے۔ جو تھیکا راٹے کا یہ گانا "گھونگھٹ کے پٹ کھول تو رے پیا ملیں گے"۔ فوراً ضبط ہو جانا چاہیے کہ یہ پردہ دار عورتوں کو بہکانے کا موجب ہو سکتا ہے"۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

ٹی ہاؤس میں ایک ترقی پسند کہہ رہا ہے "پردے کے مسئلے پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ ستر پوشی کا خیال پہلے باوا آدم کے دل میں پیدا ہوا یا اماں حوا کے دل میں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ شروع شروع میں دونوں اس سے غافل تھے۔ لیکن جب ہابیل اور قابیل پیدا ہوئے تو باوا آدم کو اپنی بیوی کی ستر پوشی کا خیال آیا . . . اور انسان کا سب سے پہلا لباس انجیر کے پتوں سے تیار ہوا . . . اب ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ عورت کے کس حصۂ جسم کی ستر پوشی آدم نے سب سے پہلے ضروری سمجھی . . . .

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

بازار میں ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔

"آج شام کو چھ بجے منٹو پارک میں جس کا اسلامی نام باغِ عدن رکھا گیا ہے۔ مولانا گل داؤدی کے زیرِ صدارت ایک عظیم الشان جلسہ ہوگا جس میں بیگم لیاقت علیخاں کے اس بیان کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوگی جو انہوں نے بے پردگی کی حمایت میں دیا ہے۔"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

مال روڈ پر فٹ پاتھ کے ساتھ گھاس کی روش پر ایک آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے اور اپنے دوستوں سے کہہ رہا ہے۔

"پردہ کرنے والی عورتوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ان کی ہے جو صرف اپنے رشتہ داروں سے پردہ کرتی ہیں، نامحرم مردوں سے انہیں کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا۔ ایک قسم ان کی بھی ہے جن کا پردہ اپنی گلی کے مردوں تک محدود ہے — سارے شہر میں پردہ در بغل یا بردہ بدوش پھرتی رہیں گی۔ لیکن گلی میں داخل ہوتے ہی پردہ پوش ہو جائیں گی۔ لیکن خطرناک قسم ان عورتوں کی ہے جو پردہ کرتی ہیں لیکن در پردہ پردہ نہیں کرتیں۔"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

گھر میں ایک بزرگ اپنی اولاد سے مخاطب ہیں۔ "اس وقت ہندوستان میں میرا مطلب ہے پاکستان میں، دو لعنتیں بہت عام ہیں۔ بے پردگی اور ترقی پسندی

دونوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ بے پردگی سے بے حیائی پیدا ہوتی ہے
اور ترقی پسندی سے فحش نگاری۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

سڑک پر ایک آدمی اخبار پڑھ رہا ہے۔
"لاہور کے ایک مجسٹریٹ نے آج ایک آوارہ نوجوان کو جس کا نام اسلم ہے
دفعہ ۱۰۹ کے ماتحت دو ماہ قید سخت کی سزا دی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ملزم برقع
پہن کر میکلوڈ روڈ پر چہل قدمی کر رہا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

تانگہ میں ایک برقع پوش لڑکی اپنی برقع پوش سہیلی سے کہتی ہے"۔ آج
ہمیں سائنس ماسٹر نے بتایا ہے کہ سیاہ چیزیں حرارت کو بہت زیادہ کھینچتی ہیں
پھر یہ کالے برقعے کیوں پہنے جاتے ہیں؟"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

کلاس میں اُستاد لڑکوں سے پوچھتا ہے"۔ پردے کا سب سے بڑا حامی کون ہے؟"
ایک لڑکا جواب دیتا ہے۔ وہ شاعر جس نے یہ شعر کہا ؎

مری لحد پہ کوئی پردہ پوش آتا ہے
چراغِ گورِ غریباں صبا بجھا دینا

اُستاد:۔ شاباش! — پردے کے خلاف کون کون سے شاعر تھے؟

لڑکا، یہ سبھی تھے۔ لیکن ان میں غالب مشہور ہے۔ کہتا ہے ؎

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے "

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

کلب میں شغل مے نوشی جاری ہے۔ ایک خوش پوش نوجوان چہک رہا ہے
نہیں نہیں پردہ ضرور ہونا چاہیئے اور برقعے سفید نہیں کالے ہونے چاہئیں۔
نئے فیشن کے ــــ گورے گورے ہاتھ جھین نقاب تھامے ہوں کبھی ہوا کے
جھونکے سے یہ حریری پردہ لرز کر تھوڑا سا اڑ جائے۔۔۔ بس دیکھا کرے کوئی
ــــ خدا جنت میں سب سے اونچا مقام دے اس برقعے کے موجد کو۔۔۔ کبھی کان
کا جھمکا جھلک دکھا جاتا ہے، کبھی آم کی کیری ایسی ٹھوڑی۔۔۔ اور وہ ہونٹوں
کی جیتے جیتے لہو جیسی سرخی۔۔۔ "

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ملکہ کے بت کے پاس ایک لڑکا اپنے دوست سے کہتا ہے:۔
"یہ نقاب کشائی کی رسم کیا ہے ــــ جب مجسمہ تیار ہوتا ہے تو اسے کوئی
نہیں ڈھانکتا۔ لیکن جونہی نصب کیا جاتا ہے تو اس پر کالی چادر چڑھا دیتے ہیں۔
اور کسی بڑے آدمی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس کی نقاب کشائی کرے۔
ــــ میرا خیال ہے یہ پردے کا سلسلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ایک آدمی اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے "میں پردہ کا حامی ہوں۔ لیکن میں نے قبلہ دادا جان سے سنا تھا کہ علی گڑھ میں ایک دفعہ صرف اس لئے بلوہ ہو گیا تھا کہ ایک عورت بے پردہ باہر نکل آئی تھی ـــ اس لئے بھئی تم پردہ نہ کرو تو بہتر ہے"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘

دیوار پر ایک اشتہار چسپاں ہے:۔

برقع پہن کر بحفاظت چلنے کی تعلیم دینے والا پہلا اسلامی مدرسہ۔

ہم نے دیہاتی عورتوں اور اُن خواتین کے لئے جو پردے کی عادی نہیں ہیں برقع پہن کر سڑکوں پر بحفاظت چلنے پھرنے اور سائیکل چلانے کی تعلیم دینے کے لئے ایک اسکول قائم کیا ہے۔ ایک مہینے کے اندر اندر ہر عورت کو ایکسپرٹ برقع پوش بنانے کی گارنٹی کی جاتی ہے ـــ آزمائش شرط ہے۔ فیس بالکل واجبی ہے۔ دورانِ تعلیم میں برقع اسکول مفت مہیا کرے گا۔

پردہ گرتا ہے

مفت نوشوں کی تیرہ قسمیں

پہلی قسم

آپ سینما ہال میں بیٹھے ہیں۔ ڈبیہ کھول کر سگریٹ نکالتے ہیں۔ برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تماشائی مفت نوش ہے۔ وہ آپ کے ڈبے کو غور سے دیکھے گا اور کہے گا "کیوں صاحب آپ یہ سگریٹ کہاں سے لیتے ہیں۔ بلیک مارکیٹ سے؟"

"جی ہاں۔"

"اوہ جبھی ۔۔۔ ورنہ میں بہت تلاش کر چکا ہوں۔ کہیں ملتا ہی نہیں۔ بہت اچھا سگریٹ ہے۔"

"شوق فرمائیے۔"

"شکریہ"

انٹرول کے بعد وہ خود آپ سے سگریٹ مانگے گا "صاحب لطف آگیا۔ ناگوارِ خاطر

نہ ہو تو ایک اور عنایت فرمائیے۔

دوسری قسم

آپ ریل گاڑی میں سوار ہوتے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ آپ پیکیٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہیں تو ایک دم آپ کے ساتھ بیٹھا ہوا مسافر اپنی جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے منہ سے کچھ اس قسم کا کلمہ نکلتا ہے۔ "لعنت" یا "حد ہو گئی"۔ آپ ضرور پوچھیں گے "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں صاحب! سگریٹ کا ڈبہ تانگے میں رہ گیا ہے۔"

"اوہ — فی الحال یہ شوق فرمائیے۔"

اور دیر تک وہ آپ کے سگریٹوں سے شوق فرماتا رہے گا۔

تیسری قسم

زید آپ کا دوست ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ وہ مفت نوش ہے۔ ہر روز وہ آپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہے اور بڑے پُر تکلف انداز میں کہتا ہے۔ "لاؤ بھئی اب سگریٹ پلواؤ۔"

چوتھی قسم

آپ کسی باغ میں بنچ پر بیٹھے ہیں۔ آپ کے ساتھ ہی ایک اور صاحب بیٹھے

کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں۔ آپ جیب سے سگرٹ کی ڈبیا نکالتے ہیں۔ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے صاحب جو مفت نوش ہیں۔ فوراً جیب سے دیا سلائی نکالیں گے اور جلا کر آپ کی طرف بڑھا دیں گے۔ آپ ان کا شکریہ ادا کریں گے اور سگریٹ کی ڈبیا ان کی طرف بڑھا دیں گے۔

"شوق فرمائیے"۔

وہ بھی آپ کا شکریہ ادا کریں گے۔

پانچویں قسم

بکر سے آپ کی ملاقات گاہے گاہے ہوتی ہے۔ اس لئے آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مفت نوش ہے۔ جب آپ سے ملے گا۔ اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالے گا اور آپ کو پیش کرے گا۔ آپ پیکٹ کھولیں گے مگر وہ خالی ہو گا۔ بکر مناسب و موزوں الفاظ میں اپنی خفت کا اظہار کر دے گا۔ آپ جیب سے اپنا پیکٹ نکالیں گے اور اس کو پیش کر دیں گے۔

چھٹی قسم

مفت نوشوں کی وہ قسم ہے جو صرف خاص قسم کے سگرٹ پیتے ہیں۔ جونہی وہ کسی دوست یا معمولی جان پہچان کے ہاتھ میں پانچ پانچ یا کریون اے کا

ڈبا دیکھیں گے تو خوشی کا نعرہ بلند کر کے کہیں گے "زندہ باد . . . . یہ ہے سگرٹ پینے کے لائق"۔

ایک سگرٹ ہونٹوں میں دبا کر وہ چھ سات اپنی جیب میں ڈال لیں گے "معاف فرمایئے گا۔ ایک سے میرے ذوق کی تسکین نہیں ہوگی"۔

ساتویں قسم

ذرا جارحانہ قسم کی ہے ۔ آپ اپنے دوستوں کے ساتھ وائی ایم سی اے ہال کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں ۔ سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر انگلیوں میں تھامتے ہیں ۔ دیا سلائی سلگانے ہی کو ہیں کہ ایک راہ چلتا جلدی سے آپ کے پاس آتا ہے ۔ انگلیوں میں سے سگرٹ نکال لیتا ہے ۔ دیا سلائی طلب کرتا ہے اور سگرٹ سلگا کر یہ جا وہ جا ۔ آپ سمجھتے ہیں ۔ پاگل تھا ۔ چنانچہ دیر تک یہ عجیب و غریب حادثہ آپ کا اور آپ کے دوستوں کا موضوعِ سخن بنا رہتا ہے ۔

آٹھویں قسم

بڑی ڈھیٹ قسم ہے ۔ آپ تنگ آکر کہتے ہیں "بھئی اپنی جیب سے کیوں نہیں پیتے"؟

جواب ملتا ہے "میں قسم کھا چکا ہوں کہ اپنی جیب سے کبھی ایک سگرٹ بھی نہیں

خرید دں گا۔ مفت کے مال کا کچھ اور ہی مزا ہے۔"

نویں قسم

آٹھویں سے کچھ مختلف ہے۔ آپ تنگ آ کر پوچھتے ہیں۔ "بھئی تم اپنی جیب سے کیوں نہیں پیتے۔"

جواب ملے گا۔ "ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ہے کہ سگرٹ میرے لئے بہت ہی مضر ہے اپنی جیب میں سگرٹ پڑے ہوں تو مجھ سے کنٹرول نہیں ہوتا۔ اس لئے کبھی کبھار دوستوں سے مانگ کر پی لیتا ہوں۔"

دسویں قسم

قصیدہ گو مفت نوشوں کی ہے۔ "بھئی خدا کی قسم! منٹو بادشاہ ہے سگرٹوں کا۔ دنیا بھر میں آپ کو اچھا سگرٹ نہ ملتا ہو۔ لیکن منٹو کے پاس ضرور ہوگا۔ ۔ ۔ لاؤ دوست! دیکھیں آج کل کیا پیتے ہو؟"

"بہت ہی معمولی برانڈ ہے۔ کیپسٹن۔"

"تم اور کیپسٹن پیو! ضرور اس میں بھی کوئی بات ہو گی۔ ۔ ۔ ۔ لاؤ دیکھیں۔"

گیارھویں قسم

ایک دو سگرٹوں پر نہیں۔ پورے ڈبے پر حملہ آور ہوتی ہے "بھئی معاف

کرنا۔ میں تمہارا ڈبہ لئے جا رہا ہوں۔ میرا دندان ساز کے یہاں رہ گیا ہے" یا "دو ڈبے مجھے دے دو۔ میرے کل یا پرسوں تک آنے والے ہیں۔ لوٹا دوں گا۔"

بارھویں قسم

وہ ہے جس کو دیکھتے ہی لوگ اپنے اپنے سگرٹ زور سے تھام لیتے ہیں یا اپنا بھرا پیکٹ خالی ظاہر کر کے پھینک دیتے ہیں۔

تیرھویں قسم

وہ ہے۔ جو تھوڑی دیر آپ سے باتیں کریں گے اور رخصت ہونے وقت زمین پر سے آپ کا پھینکا ہوا پیکٹ یہ کہکر اٹھا لیں گے "بچے کے لئے جاتا ہوں۔ اُسے خالی ڈبیوں سے کھیلنے کا بہت شوق ہے۔"

پٹاخے

ایک خبر

پاکستان میں بچّوں کو آتش بازی کی لعنت سے بچانے کے لیے حال ہی میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا نام "انجمن انسدادِ پٹاخہ جات" ہے۔ اس کا صدر دفتر بارود خانہ میں قائم کیا گیا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ بہت جلد اس کی شاخیں رُوس، امریکہ اور انگلستان میں بھی قائم کر دی جائیں گی۔

دوسری خبر

اس سال آتشبازی سے جل کر مرنے والے بچوں کی تعداد پچھلے سال سے دو گنا بتائی جاتی ہے۔ پاکستانی والدین نے اس پر بہت تشویش کا اظہار کیا ہے اور حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ آتش بازی سے جل کر مرنے والے بچّوں کی ایک سالانہ

تعداد مقرر کر دے۔ حکومت سے اسی سلسلے میں چنانچہ ایک نئی وزارت قائم کرنے کی استدعا بھی کی گئی ہے۔ اس وزارت کا عہدہ سنبھالنے والے وزیر پٹاخہ کہلائیں گے سُنا ہے کہ مشرقی پنجاب کے دو بہت بڑے مہاجر آتش بازوں میں یہ وزارت حاصل کرنے کے لئے جوڑ توڑ ہوں گے۔

ایک مکالمہ

ایک باپ۔ آتش بازی چلانا ٹھیک نہیں۔

ایک بچہ۔ کیوں؟

باپ۔ پیسہ ضائع ہوتا ہے۔

بچہ۔ اتنی بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔ کیا اُن میں پیسہ ضائع نہیں ہوتا

دوسرا مکالمہ

ایک بچہ۔ میں آتش بازی نہیں چلاؤں گا۔

ایک باپ۔ کیوں؟

بچہ۔ میں بہت برخوردار ہوں۔

باپ۔ کیا کہا؟ ــــ چلو ڈاکٹر کے پاس ضرور تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

ایک سبق

سردیوں میں مولی نہ کھاؤ اور عید شب برات پر آتش بازی نہ چلاؤ۔

دوسرا سبق

گرمیوں میں مولی کھاؤ اور عید شب برات چھوڑ کر ہر روز آتش بازی چلاؤ۔

ایک تحقیق

نفسیات کے ماہرین بڑی تحقیق و تدقیق کے بعد اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ خوشی کا پرجوش مظاہرہ کرنے کے لئے پٹاخے چھوڑنا اور آتش بازی چلانا انسان کی جبلت ہے۔ بیس ہزار سال قبل از مسیح کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلا پٹاخہ ایک انسان کی کھوپڑی کا چلایا گیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ جب لوگوں کو احساس ہوا کہ ایسا پٹاخہ چلانے سے ایک انسان کم ہو جاتا ہے تو دوسرے پٹاخے ایجاد ہونے شروع ہوئے۔

دوسری تحقیق

نفسیات کے ماہرین بڑی تحقیق و تدقیق کے بعد اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ شروع شروع میں انسان نے درندوں کو ڈرانے کے لئے پٹاخے اور آتش بازیاں ایجاد

کی تھیں۔ لیکن بعد میں جب انسان درندوں کا بھیس بدلنے لگے تو یہ پٹاخے اور آتش بازیاں گولیوں اور بموں کی شکل اختیار کر گئیں۔

ایک فرمائش

ایک بچہ۔ ابّا جی! مجھے یہ پٹاخہ نہیں چاہئے۔

ایک باپ۔ کیوں؟

بچہ۔ بڑے زور سے پھٹتا ہے۔ میں ڈر جاتا ہوں — کوئی ایسا پٹاخہ لا دیجئے جو زور سے نہ پھٹے۔

دوسری فرمائش

ایک بچہ۔ ابّا جی، ایٹم بم کیا ہوتا ہے؟

ایک باپ۔ دُنیا کا سب سے بڑا پٹاخہ۔

بچہ۔ مجھے ایک لا دیجئے۔ شب برات پر چلاؤں گا۔

ایک سایہ

ایک آدمی اپنے کم سن بچے کو ساتھ لے کر ایک فقیر کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

"پیر و مرشد۔ میں شاہ عالمی کے پاس رہتا ہوں۔ یہ میرا بچہ ہے۔ خدا معلوم اسے کیا ہو گیا

ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جنّات کا سایہ ہے۔ پٹاخے کی آواز سُن کر ہی اس پر تشنج کے دورے پڑنے لگتے ہیں"۔

دوسرا سایہ

ایک آدمی اپنے کم سن بچے کو ساتھ لے کر ایک فقیر کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

"پیر و مُرشد — میں مہاجر ہوں۔ امرتسر سے آیا ہوں۔ میرے اس بچے کے لئے کوئی تعویذ دیجئے — جب بھی اسے موقع ملتا ہے۔ اِدھر اُدھر سے چیزیں اکٹھی کرتا ہے اور انہیں آگ لگا دیتا ہے"۔

پہلی پھلجھڑی

ایک بچّہ۔ انار کلی میں ایک لڑکی جا رہی تھی۔ اُس کی طرف دیکھ کر ایک آدمی نے اپنے دوست سے کہا "بالکل پٹاخہ ہے"۔

دوسرا بچّہ۔ کیا وہ چلا؟

پہلا بچہ۔ ہاں — اُس لڑکی نے جوتا اتارا اور پٹاخ سے اُس آدمی کے سر پر جڑ دیا۔

دوسری پھلجھڑی

ایک بچہ۔ آتش بازی چلانے سے ہمیں کیوں منع کیا جاتا ہے؟

دوسرا بچہ۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

پہلا بچہ۔ گدھے کہیں کے — ریڈیو پر، اخباروں میں، تقریروں میں ہر روز یہی بکواس کرتے ہیں کہ بچّوں کو آتش بازی کی لعنت سے دور رکھا جائے۔ لیکن دکانیں بھری ہوئی ہیں آتش بازیوں سے — کیوں نہیں ایسا کرتے کہ آتش بازی بنانا ہی بند کر دیں۔

دوسرا بچہ۔ ش ش ش .... کوئی سُن نہ لے۔

کارل مارکس

آں کلیمِ بے تجلی آں مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

اقبال

تمام دنیا کی نگاہیں آج کل روس پر جمی رہتی ہیں۔ آج سے پہلے بھی جمی رہتی تھیں مگر ان نگاہوں میں تمسخر کی ایک جھلک تھی، ایک قسم کا استہزا تھا۔ یورپ میں سیاست کی ٹیڑھی ٹوپی پہننے والے بانکے، روس کے مزدوروں کی جد و جہد دیکھتے تھے اور زیرِ لب مسکراتے تھے ـــــ روس میں صدیوں کے غلاموں نے جب اپنی زنجیروں کا لوہا گلا گلا کر ایک نئی سلطنت کی بنیادوں کو بٹھانا شروع کیا تو آزاد قوموں نے کئی بار ان کا مضحکہ اڑایا ـــ اپنا گھر درست کرنے کے لئے جب ان لوگوں نے گرمجوشی کا آغاز کیا تو بنے بنائے اور سجے سجائے گھروں میں رہنے والے کھلکھلا کر ہنستے رہے۔

وہ کوشش جو کبھی دیوانگی پر محمول کی جاتی تھی۔ وہ سعی جو کبھی ناممکن اور بے ثمر یقین کی جاتی تھی — وہ سلطنت جو کبھی مزدوروں کا ایک خیالِ خام سمجھی جاتی تھی۔ معرضِ وجود میں آئی — سیاست کی ٹیڑھی ٹوپی پہننے والوں، مذہب کا لمبا جبہ زیب تن کرنے والوں، آزاد اور غلام قوموں، شکستہ جھونپڑوں اور مرمریں محلوں میں بسنے والوں نے دیکھا۔ وہ معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کو "سوویٹ روس" کہتے ہیں۔

سوویٹ روس اب خواب نہیں۔ خیالِ خام نہیں۔ دیوانہ پن نہیں — ایک ٹھوس حقیقت ہے — وہ ٹھوس حقیقت جو ہٹلر کے فولادی ارادوں سے کئی ہزار میل لمبے جنگی میدانوں میں ٹکرائی اور جس نے فاشیت — آہن پوش فاشیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے — وہ اشتراکیت جو کبھی سر پھرے لونڈوں کا کھیل سمجھا جاتا تھا۔ وہ اشتراکیت جو کبھی دل بہلاوے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا — وہی اشتراکیت جس کے ساتھ یورپ کی متعدد طہارت پسند قوموں نے ایک فاحشہ کا سا سلوک کیا — وہی اشتراکیت جو ننگِ دین اور ننگِ انسانیت یقین کی جاتی تھی۔ آج روس کی وسیع و عریض میدانوں میں بیمار انسانیت کے لئے امید کی ایک کرن بن کر چمک رہی ہے۔

یہ وہی اشتراکیت ہے جس کا نقشہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کارل مارکس نے تیار کیا — قابلِ احترام ہے یہ انسان جس نے اپنی ذات کے لئے نہیں، اپنی قوم کے لئے نہیں۔ اپنی نسل کے لئے نہیں۔ اپنے ملک کے لئے نہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے لئے، ساری انسانیت کے لئے، مساوات اور اخوت کا ایک ذریعہ تلاش کیا۔

جس طرح کیچڑ میں کنول پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح سرمایہ پرست یہودیوں کے ایک گھرانے میں سرمایہ شکن کارل مارکس پیدا ہوا۔ پانچ مئی سن اٹھارہ سو اٹھارہ کو ۔۔۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے متعلق باپ نے یہ رائے قائم کی کہ یہ بڑا ہو کر شیطان نکلے گا۔ کارل مارکس بڑا ہو کر شیطان نکلا یا فرشتہ۔ اس کا کچھ اندازہ تو ہماری موجودہ نسلیں کر چکی ہیں۔ قطعی فیصلہ آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہے ۔۔ اس مختصر فیچر میں جواب آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ ہم اس شیطان یا فرشتے کے مختصر سوانح حیات نیم ڈرامائی شکل میں پیش کریں گے۔

باپ۔ خدا ہمارے حال پر رحم کرے ۔۔ تمہارے اس لڑکے نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔

ماں۔ جیسا میرا ہے۔ ویسا آپ کا ہے۔ یہ آپ ہر وقت مجھے ہی کیوں طعنے دیتے رہتے ہیں۔

باپ۔ بھئی! میں پریشان ہو گیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں ۔۔ غبی ہوتا کند ذہن ہوتا تو میں خاموش ہو کے بیٹھ جاتا۔ مگر کم بخت ذہین ہے ۔۔ بلا کا ذہین ہے۔ چاہے تو سب کچھ سیکھ سکتا ہے۔

ماں۔ مگر اس کا دل بھی کسی طرف لگے؟

باپ۔ اسی بات کا تو رونا ہے۔ اسکول میں بھی اس کے یہی چلن تھے۔ اب

کالج میں داخل ہو کر تو اور بھی زیادہ آوارہ گرد ہو گیا ہے۔ تعلیم کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا۔ بڑی بے فکری اور بے پروائی سے یہ زمانہ جو اس کی زندگی میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے گزار رہا ہے۔ ہزار بار سمجھا چکا ہوں مگر صاحبزادے کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی ۔۔۔ وہ خاص مضمون یعنی قانون جو میں نے اسکے لئے منتخب کیا تھا۔ اُس کی طرف سنتا ہوں کچھ توجہ ہی نہیں دیتا۔ میں اس کا یہ لاابالی پن کب تک برداشت کرتا رہوں گا۔ صبر کی ایک حد ہوتی ہے۔

ماں ۔ تازہ خط میں اُس نے آپ کو کیا لکھا ہے ؟

باپ ۔ (تمسخر کے ساتھ) ذہنی اُلجھنوں اور روحانی پریشانیوں کے باعث آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اس لئے کچھ دن ہسپتال میں رہے۔ وہاں سے واپس آ کر بھی جب آپ کی روحانی کشمکش ختم نہ ہوئی تو مجھے لکھتے ہیں۔ "ابا جی میرے ذہن میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو رہا ہے ۔۔۔ اس انقلاب کی پوری تفصیل حاضر خدمت ہو کر ہی عرض کر سکتا ہوں۔ اجازت عنایت ہو تاکہ میں اپنی روح کا بوجھ ہلکا کر سکوں" ۔۔۔ یہ لکھا ہے آپ نے ۔۔۔ (ہنستا ہے) اپنی روح کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے برخوردار یہاں آنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے اجازت مانگتے ہیں۔

ماں ۔ یہ رُوح کا بوجھ کیا ہو سکتا ہے ؟

باپ ۔ کوئی نیا عشق لڑایا ہو گا آپ نے ۔ یا دہی پرانا ہو گا اور ہسپتال میں جا کر عود کر آیا

ہوگا۔

ماں۔ سچ مچ یہ اُس کو کیا خبط سمایا۔ جو اُس جینی سے جو عمر میں اُس سے چار سال بڑی ہے۔ شادی کرنے پر تُلا ہوا ہے۔

باپ۔ اسی کو تو روحانی بیماری کہتے ہیں۔ چونکہ اُس کا علاج ہسپتال میں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہاں تشریف لانا چاہتے ہیں۔ جیسے میں اجازت دے دونگا کہ جاؤ میاں اپنے سے دُگنی عمر کی لڑکی سے شادی کر لو۔

ماں۔ مگر آپ تو اُسے جینی سے شادی کرنے کی اجازت دے چکے ہیں۔

باپ۔ یہ جھک میں نے صرف اس لئے ماری تھی کہ وُہ جینی سے خط و کتابت کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اُس نے کالج کا پہلا سال شعر و شاعری میں گزارا ہے۔ تین کاپیوں میں ڈیڑھ ہزار شعر دیکھ چکا ہوں جو اُس نے اس ناشدنی جینی کے نام منسوب کئے تھے ــــ میں نے اس کو اجازت دی تھی۔ تا کہ یہ عشقیہ شعر و شاعری اور خط و کتابت کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ وُہ نئی مراعات چاہتا ہے۔

ماں۔ آپ نے خط کا جواب لکھ دیا۔

باپ۔ ہاں لکھ دیا ــــ لو تم بھی سن لو۔۔۔۔ (خط پڑھتا ہے)۔۔۔۔ "خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔۔۔۔ تم دلجمعی سے بالکل کام نہیں لیتے اور علم کے مختلف شعبوں میں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو۔ بے ربط غور و فکر ہمیشہ بے نتیجہ

رہتا ہے۔ بے ربط علمی مشاغل سے وقت اسی طرح ذبح ہوتا ہے جس طرح
بادہ وساغر سے ــــ والدین کی خوشنودی کی طرف تم نے کبھی توجہ نہیں دی
اس لئے کہ تم اُسے بالکل مہمل سمجھتے ہو ــ میں تمہیں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔
جینی کے محبت بھرے خطوط اور ایک نیک نیت اور شفیق باپ کی چٹھیوں
سے تم اپنا پائپ سلگاتے ہو گے۔ خیر یہ بھی بُرا نہیں۔ کیونکہ اس طرح یہ خطوط
غیر لوگوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے توبچ جائیں گے۔ کیونکہ تمہارے پیو پڑیپ میں
سے تو یہی اُمید ہے کہ جلائے نہ جائیں گے تو دوسروں تک ضرور پہنچ جائینگے
ــــ اگرچہ امیر سے امیر لڑکا بھی کالج میں پانسو تھیلر خرچ کرتا ہے۔ لیکن تم ایسے
ہو کہ سات سو تھیلر چٹ کر جاتے ہو اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ تم شاید یہ سمجھتے
ہو۔ کہ میں سونے کا بنا ہوں ــــ گھر آنا فضول ہے۔ اگرچہ مجھے معلوم ہے
کہ تمہارے نزدیک کالج کے لکچروں کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن کلاس میں
جو تم رسمی طور پر چلے جاتے ہو۔ اگر یہی جاری رہے تو غنیمت ہے۔"

باپ کے اس خط کا یہ اثر ہوا۔ کہ ایسٹر کی چھٹیوں میں کارل مارکس کالج ہی میں
رہا۔ ماں کو رنج ہوا۔ لیکن باپ خوش تھا ــــ مارکس کی خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی کہ
اُس کے والد تھوڑے ہی عرصے کے بعد بیمار پڑے اور ۱۰ مئی ۱۸۳۸ء کو فوت
ہو گئے ــــ والد کی وفات کے بعد مارکس کی تعلیم بصد خرابی جاری رہی۔ آخر کار

ایک فلسفیانہ مضمون لکھنے پر اسے "جینا یونیورسٹی" سے پی۔ایچ۔ڈی کی سند مل گئی۔ چونکہ مارکس کے عقیدے کے بموجب علم و عمل ایک ہی شے کے دو رُخ تھے۔ اس لئے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اُس نے فوراً سیاسی میدان میں جدوجہد شروع کردی۔ زیٹانگ نامی ایک اخبار کا مدیر بنا اور حکومت کی پالیسی پر اس شدت سے تنقید کی کہ اخبار ضبط کر لیا گیا۔

مارکس۔ روگی۔ میرے دوست ضبطی کے اس حکم پر مجھے قطعاً تعجب نہیں ہوا — افسوس بھی کچھ زیادہ نہیں ہوا۔

روگی۔ کیوں؟

مارکس۔ ضبطی کا حکم اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ عوام میں سیاسی بیداری بڑھ رہی ہے — جب کسی قوم میں سیاسی بیداری کے آثار پیدا ہونے لگیں تو تحریر و تقریر پر اسی طرح پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے "زیٹانگ" بند ہونے پر سنسر افسر نے کیا لکھا تھا؟

روگی۔ کیا لکھا تھا؟

مارکس۔ میں خوش ہوں کہ مارکس کے دست بردار ہو جانے کا یہ اثر ہوا ہے۔ کہ آج میں نے اپنا تمام کام ایک چوتھائی وقت میں ختم کر لیا۔

روگی۔ تم نے ادارت سے استعفےٰ کیوں دیا؟

مارکس۔ اور کیا کرتا۔ بھائی ایسے ماحول میں جہاں قدم قدم پر غلامی ہو۔ مجھ سے کام نہیں ہو سکتا۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ آزادی کے لئے سوئیوں سے لڑنا مجھے پسند نہیں۔ میں حاکم طبقے کی بے رحمی اور بے وقوفی اور اپنے ہمعصروں کی جی حضوری۔ چاپلوسی۔ بہانہ سازی اور بیکار کے بحث مباحثے سے تنگ آگیا ہوں ۔۔ جرمنی میں رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا کی قسم کچھ نہیں کر سکتا۔ اس ملک میں رہنا اپنی توہین ہے، ذلت ہے۔

روگی۔ تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

مارکس۔ سوچ رہا ہوں کہ کوئی رستہ نکل آئے۔ آج کل مفت کی پریشانی اور خواہ مخواہ کی بحثوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اُدھر میرے کنبے والے بیکار میری شادی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ کوئی انہیں سمجھائے تو کیسے سمجھائے؟ ۔۔ عشقیہ جذبات برطرف۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ مجھے اپنی ہونے والی بیوی سے بے پناہ محبت ہے۔ آج منگنی ہوئے سات برس ہو چکے ہیں۔ وہ بیچاری اپنے اور میرے عزیزوں کو راضی کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر وہ ایسے خر دماغ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے

روگی۔ جینی کے رشتہ دار اس شادی کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

مارکس۔ تم یہ بھی نہیں سمجھتے۔ بھائی! وہ لوگ برلن کی حکومت کی اُسی قدر عزت کرتے ہیں۔ جتنی اپنے آسمانی باپ کی۔ اور میں حکومت کا بیری ۔۔ بُہت

بڑا دشمن ٹھیرا اس ڈھونگ کا۔ رہے میرے عزیز تو وہ بھی اپنے انفرادی مفاد کے پیشِ نظر اس رشتے کے خلاف ہیں۔ کئی برسوں سے میں اور جینی اس شادی کے معاملے میں اپنے سے نگتی عمر والوں سے بحث کر رہے ہیں لیکن بڈھوں کی اس دلیل کا کیا کیا جائے جو وہ ہر بات میں سامنے لے آتے ہیں۔ "یہ ہماری زندگی کا تجربہ ہے۔ جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے۔ اُس وقت سمجھو گے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اُن کی عمر تک پہنچ کر جینی سے شادی کروں۔

روگی۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے ایک اخبار جاری کردوں۔ اگر میرا سکیم پوری ہو گئی تو میں سمجھتا ہوں کہ تمھاری بہت سی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مارکس کے دوست روگی کی اسکیم نے عملی جامہ پہن لیا اس نے ایک اور اخبار نکالا اور مارکس کو بیانسو تھیلر ماہانہ پر اس کا اڈیٹر مقرر کر دیا۔ فکرِ معاش سے آزادی ہوئی تو مارکس نے اُنیس جولائی اٹھارہ سو تینتالیس میں جینی سے شادی کر لی اور پیرس چلا گیا۔ یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ مارکس نے گزارے کے لئے ایک اخبار کے ادارے میں کام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں اُس کی ملاقات مشہور شاعر ہائنے سے ہوئی۔ ہائنے اگرچہ جرمن تھا۔ لیکن فرانسیسی اس کو اپنا قومی شاعر مانتے تھے جب شاعر نے پروشا کی حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف متواتر گیارہ نظمیں شائع کرائیں تو حکومت پروشا نے فرانس پر اثر ڈال کر اخبار کے مدیروں کے خلاف

جن میں مارکس بھی شامل تھا۔ جلاوطنی کا حکم صادر کرادیا۔ مارکس اپنی بیوی سمیت برسلز چلا گیا۔

بیوی:۔ اب ہمارا گزارے کی کیا صورت ہوگی ۔۔ یہ لوگ ہمیں کہیں بھی چین نہیں لینے دیتے۔

مارکس:۔ کچھ فکر نہ کرو۔ اللہ میاں نے بندوبست کردیا ہے ۔۔ یہ دیکھو۔ ابھی ابھی میرے شفیق دوست فریڈرک اینجلز کا خط آیا ہے۔

بیوی:۔ (خوش ہوکر) کیا لکھتے ہیں۔

مارکس:۔ (خط کھولتا ہے) چندہ جمع کر کے اُس نے کچھ روپیہ بھیجا ہے معلوم نہیں کتنا، آج یا کل مل جائے گا ۔۔ ہاں تو خط میں لکھا ہے ۔۔" معلوم نہیں یہ رقم برسلز میں تمہارے گزارے کے لئے کافی بھی ہوگی یا نہیں۔ لیکن تم کچھ فکر نہ کرو۔ میری انگریزی تصنیف کا جو معاوضہ بھی ملے گا۔ میں تمہیں فوراً روانہ کردوں گا۔ مجھے خرچ کی مطلق ضرورت نہیں اور اگر ہوئی بھی تو یہاں سے روپیہ ملتا رہے گا۔ دراصل میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دشمن اس بات سے خوش ہوں کہ مالی مشکلات سے تمہیں پریشانی ہوئی۔

بیوی:۔ خدا آپ کے اس مشفق دوست کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے۔ آپ کی کتنی خبر گیری کرتا ہے۔

مارکس :۔ بیگم ۔ اینجلز کو صرف میرا دوست کہنا اُس کی اور میری دونوں کی توہین ہے ــــ ہم دونو ایک ہیں۔ ہماری زندگی ایک دوسرے سے اس درجہ وابستہ ہو چکی ہے کہ ہم دونوں روحانی طور پر ایک ہو چکے ہیں ــــ اینجلز میرا اور میں اس کا ہمزاد ہوں۔

بیوی :۔ اُن سے آپ کی پہلی ملاقات شاید زیٹانگ اخبار کے دفتر میں ہوئی تھی ؟

مارکس :۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن ہماری دوستی کا آغاز اُس وقت ہوا۔ جب اینجلز نے اپنی پہلی کتاب لکھی اور میں نے اُس کی بہت تعریف کی۔ سچ تو یہ ہے کہ اقتصادی میدان میں اینجلز کی نظر بہت وسیع ہے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ مارکس بہ نسبت میرے زیادہ دُور۔ زیادہ گہرا اور زیادہ جلدی دیکھتا ہے۔ یہ اُس کی کسرِ نفسی ہے۔

اینجلز اور مارکس کی زندگی واقعی ایک دوسرے سے غایت درجہ وابستہ تھی۔ باوجود اینجلز کی کسرِ نفسی کے یہ ماننا پڑتا ہے۔ اور جیسا کہ خود مارکس تسلیم کرتا ہے ابتدا میں اقتصادی میدان میں اینجلز نے دیا اور کارل مارکس نے لیا۔ دونو ایک جان دو قالب تھے ــــ خیر ــــ بروسلز اس زمانے میں بین الاقوامی بورژوائی رجحانات کا مرکز تھا اور اس لئے کمیونزم کی نشر و اشاعت کے لئے بہترین جگہ تھی یہاں مارکس نے اپنا کام شروع کیا ہی تھا کہ ۲۴ فروری ۱۸۴۸ء کو فرانس میں

انقلاب ہو گیا۔ بادشاہِ فرانس کو جو حادثات پیش آئے۔ انہوں نے یورپ کے تاجداروں کو ڈرا دیا۔ چنانچہ بلجیم کے بادشاہ کے حکم سے مارکس اور اُس کی بیوی کو گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے دن رہائی ملی تو جلاوطنی کا حکم صادر ہو گیا۔ مارکس نے پھر پیرس کا رخ کیا اور اپنے چند انقلابی دوستوں کی مدد سے اخبار نکالا جس سے اُس کی شہرت عام ہو گئی مگر اس طوفان میں یہ چراغ کب تک روشن رہ سکتا ہے۔ فوراً ہی حکومت کا تشدد شروع ہو گیا۔ اخبار کے حصہ داروں نے ڈر کے مارے مالی امداد سے انکار کر دیا۔ لیکن ان مشکلات کے باوجود مارکس نے اخبار بند نہ کیا۔ باپ سے ترکے میں جو سات ہزار ٹھیلر ملے تھے۔ اُس پر لگا دیئے۔ لیکن دو چار دن ہی میں اخراج کا حکم آ گیا۔ ۱۹ مئی کو مارکس نے آخری انقلاب نمبر نکالا اور اخبار بند کر دیا۔

مارکس:۔ ہمیں ستانے کے لئے حکومت بہانے کیوں تراشتی ہے۔ جھوٹ اور افترا کے پُل کیوں باندھتی ہے — ہم تو خود جلاد ہیں۔ اس لئے دوسروں سے رحم کی اُمید نہیں رکھتے۔ جب ہمارے دن پھریں گے تو ہم اپنے تشدد کے بہانے اور حیلے نہیں تراشیں گے۔

دوست:۔ اخبار بند ہونا تھا۔ سو ہو گیا۔ اب آپ کا ارادہ کیا ہے؟

مارکس:۔ ارادہ کیا ہے۔ دماغ مختل ہے۔ ہوش و حواس قائم نہیں۔ قرضخواہوں سے چھٹکارا ملے تو کچھ سوچوں بھی — مزدوروں اور کلرکوں کی تنخواہیں

ادا کرتے کرتے میرا کچومر نکل گیا ہے۔ بیوی کے پاس کچھ زیور رہ گئے تھے۔ اُن کو گروی رکھ کر اتنے دن گزارہ کیا ہے ۔۔۔ ایک دوست کو مالی امداد کیلئے لکھا تھا۔ اُس نے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔

دوست :۔ تو کیا ہوا۔ روپیہ کسی طرح تو آنا چاہیئے۔

مارکس :۔ نہیں بھائی۔ مجھے یہ طریقہ منظور نہیں۔ میں ہر عسرت برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن عوام سے بھیک مانگنا کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتا جب میں نے یہ سُنا کہ وہ میری خاطر چندہ جمع کر رہا ہے تو خدا کی قسم مجھے بہت دُکھ ہوا۔ میں نے فوراً لکھا کہ ایسی امداد مجھے نہیں چاہیئے۔ میں نے اس سے مانگا تھا۔ دوسروں سے مانگنے کے لئے نہیں کہا تھا۔

دوست :۔ کیا پیرس میں رہنے کا ارادہ ہے ؟

مارکس :۔ نہیں مطلق نہیں۔ جونہی زادِ راہ کا بندوبست ہوا۔ میں یہاں سے لندن چلا جاؤں گا۔

۲۴ راگست کو مارکس نے فرانس کو الوداع کہی اور لندن چلا آیا۔ یہاں اس کے لڑکا پیدا ہوا۔ جو مفلسی کے باعث ایک سال کے اندر اندر مر گیا ۔۔۔ چاروں طرف مصائب ہی مصائب تھے۔ لیکن ان کی موجودگی میں بھی مارکس نے اپنے علمی مشاغل جاری رکھے۔ صبح نو بجے لندن کی لائبریری میں چلا جاتا تھا اور شام

بجے سات بجے لوٹتا تھا — وہ اپنی مشہور کتاب" اقتصادیات پر" لکھ رہا تھا
اس زمانے میں تقدیر کچھ مسکرائی تو ایک دوست کے توسط سے امریکا کے ایک
اخبار کی رپورٹری مل گئی اور کچھ معاوضہ ملنے لگا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد
مارکس بیمار ہوا۔

مارکس:۔ کسی بیماری نے مجھے اتنا کمزور نہیں کیا۔ جتنا کہ اس نامراد بیماری نے کیا ہے — مرتا مرتا بچا ہوں۔

دوست:۔ اب آپ کے حالات کیسے ہیں؟

مارکس:۔ (مسکرا کر) حالات اب ایسی تسلی بخش منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ نہ باہر جا سکتا ہوں۔ کیونکہ سب کپڑے گروی پڑے ہیں۔ نہ گوشت کھا سکتا ہوں کیونکہ جو رہی سہی ساکھ تھی۔ وہ اس بیماری نے ختم کر دی ہے۔

دوست:۔ چھوٹی لڑکی کا کیا حال ہے؟

مارکس:۔ بیچاری کئی دن سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ بہت کمزور ہو گئی ہے۔ شاید ہی بچے۔ کیونکہ دوا دارو کے لئے ایک پیسہ بھی پاس نہیں۔

دوست:۔ اللہ رحم کرے۔

مارکس:۔ ہاں اللہ ہی رحم کرے . . . بیوی بیمار۔ بیٹی بیمار، لڑکے کو بخار، روپیہ پیسہ پاس نہیں ہفتے بھر سے صرف روٹی اور آلو پر گزارا کر رہا ہوں۔

شاید اب یہ بھی نہ ملے اور فاقے کرنے پڑیں۔ کاغذ خریدنے کے لئے بھی پیسے نہیں کہ مضمون لکھ کر اخبار کو روانہ کر سکوں۔ اب صرف یہ ہونا باقی ہے کہ مالک مکان گھر سے نکال دے۔ کیونکہ اُس کے بائیس پونڈ میری طرف نکلتے ہیں۔

دوست :۔ اگر اُس نے واقعی نکال دیا؟

مارکس :۔ تو بہت ہی اچھا ہو گا۔ ان بائیس پونڈوں کا بوجھ تو میرے سینے سے اُترے گا — لیکن مالکِ مکان یہ عنایت مجھ پر کیوں کرنے لگا۔ روٹی والے، دودھ والے، سبزی والے۔ قصائی۔ پرچون والے۔ ان سب کا قرضہ الگ رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مصیبتیں کب ختم ہوں گی — بڑے شرم کی بات ہے مگر چند روز سے مزدوروں سے قرض لے کر گزارا کر رہا ہوں — کیا کروں۔ ان سے بھی نہ مانگوں تو بھوکا مر جاؤں۔

دوست :۔ یہ آپ ہی کی ہمت ہے کہ مشکلات کے اِن ہجوم میں بھی اپنا کام کئے جا رہے ہیں۔

مارکس :۔ بورژوائی طبقہ مجھے میرے مقصد سے ہٹا کر سونا کمانے کی ترغیب دینا چاہتا ہے۔ میں ان کو بتا چکا ہوں کہ وہ مجھے کبھی سکّے بنانے کی مشین میں تبدیل نہیں کر سکیں گے — میں ہر مصیبت میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔

دوست :۔ مگر روپیہ کمانا بھی تو ضروری ہے۔

مارکس :۔ روپیہ کمانا چاہیئے کہ ہم زندہ رہیں اور کچھ لکھ سکیں۔ لیکن روپیہ کمانے کیلئے

ہمیں زندہ رہنا اور لکھنا ہر گز نہیں چاہیئے۔

مفلسی کا یہ عالم۔ لیکن اپنے پیشِ نظر مقصد سے ایک لمحے کے لئے بھی مارکس کی نظر نہ ہٹی۔ وُہ ایک بندۂ مومن کی طرح اعلانِ حق میں لگا رہا ۔ کڑے سے کڑے امتحانوں میں سے اُسے گزرنا پڑا۔ مگر وُہ ثابت قدم رہا۔ اُس کی جان و دل سے پیاری بچی سامنے دم توڑ رہی تھی۔ محمود فاقوں سے نڈھال تھا مگر مجال ہے کہ اُس کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش آئی ہو۔

بیوی:۔ (وحشت زدہ ہو کر) ... ننھی نے دم توڑ دیا۔

مارکس:۔ مر گئی بیچاری ؟

بیوی:۔ تین روز تک ظالم موت سے لڑتی رہی ہے ۔ ننھی سی جان تھی۔ کب تک مقابلہ کرتی۔ ... مجھ سے تو رویا بھی نہیں جاتا۔ آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آتے مجھے کیا ہو گیا ہے ؟ ۔ کیا واقعی ننھی مر گئی ہے ؟ ۔ تم جا کے دیکھو۔ شاید زندہ ہو ۔!

مارکس:۔ فراؤ۔ صبر کرو میری جان! ۔ مشیّتِ ایزدی یہی تھی ۔ میں یہاں زمین پر بستر کر دیتا ہوں۔ تم لیٹ جاؤ۔ تمہاری صحت اچھی نہیں۔ اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ جو ہونا تھا، سو ہو گیا۔ ہر حالت میں اللہ کا شکر بجا لانا چاہیئے۔

بیوی: ہائے میری محور کس طرح ٹھنڈی اور ساکت لیٹی ہوئی ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا.... مجھے بالکل یقین نہیں آتا (پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیتی ہے)

مارکس: خدا کا واسطہ ہمت سے کام لو۔ تم اس طرح روؤ گی تو میرا کیا حال ہوگا۔ صبر کرو۔ اتنے دکھ برداشت کئے ہیں۔ ایک یہ بھی سہی۔

بیوی: ماں ہوں۔ کیسے اپنا دل پتھر کا کرلوں.... میری ننھی....

مارکس: اب اس کے کفن دفن کی کچھ فکر کرنی چاہیئے۔ ہمارے پاس تو زہر کھانے کو بھی کچھ نہیں۔ (ٹھنڈی سانس لیتا ہے) بیچاری.... مرگئی.... ہاں تو اب کیا کرنا چاہیئے.... (توقف کے بعد) میت اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھ دیتا ہوں اور خود اس جلاوطن فرانسیسی کے پاس جاتا ہوں جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ ایک دو بار اُس سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا تھا۔ ضرورت کا اظہار کروں گا تو کفن دفن کے لئے شاید کچھ دیدے۔

بیوی: جب بیچاری پیدا ہوئی تھی۔ اُس وقت بھی اس کو کوئی گہوارہ نصیب نہ ہوا۔ آج رخصت ہو رہی ہے تو تابوت نہیں...

ایسے کئی تھپیڑے مارکس نے سہے مگر ثابت قدم رہا۔ لندن کے دوران قیام میں کچھ سکون پیدا ہونا شروع ہوا تھا کہ اُس کا اکلوتا لڑکا فوت ہو گیا۔ اُس کا داغِ مفارقت دے جانا قیامت تھا۔ مارکس کو اس سے بہت محبت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکے

کی وفات پر پہلی بار اُس کو محسوس ہوا کہ صدمہ کیا ہوتا ہے۔ اس حادثے کے بارے میں اُس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا اور کہا "ہیگو کہتا ہے کہ دنیا میں جو واقعی بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت کی جستجو میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ کوئی ذاتی نقصان یا صدمہ انہیں متاثر نہیں کر سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس قسم کا بڑا آدمی نہیں ہوں۔ لڑکے کی موت نے میری روح اور میرے جسم کو ہلا ہلا دیا ہے"۔ جسم اور رُوح متزلزل ہونے کے باوجود اُس نے اپنی تصنیف کا کام جاری رکھا۔ وہ ایک بہت بڑی حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا دل سیاسی ہنگاموں سے اکتا گیا تھا۔ وہ اپنے اقتصادی نظریات کو کتابی صورت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ یہ کتاب مکمل ہوئی تو مارکس کی مفلسی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ اکیس جنوری سن اٹھارہ سو انسٹھ کو "اقتصادیات پر تنقید" کا مسوّدہ بالکل تیار تھا مگر...

مارکس: امریکہ کے اقتصادی آشوب کا بہت ہی بُرا اثر پڑا ہے۔ پہلے یہ ٹربیون اخبار دو مضمون لیتا تھا۔ اب کم بخت ایک ہی لیتا ہے۔

بیوی: وہ روپیہ جو امی جان کے انتقال کے بعد میسّر آیا تھا۔ ایک برس کے اندر اندر ہی ختم ہو گیا۔

مارکس: بھئی بے شمار قرضے ادا کرنے تھے۔ آدھا تو ان ہی میں اٹھ گیا ہو گا۔ خیر، مگر اب سوچنا یہ ہے کہ اس مسوّدے کا کیا کیا جائے۔

بیوی: کوئی نہ کوئی چھاپ دے گا۔ آپ کیوں اتنی فکر کرتے ہیں؟
مارکس: فکر اس لئے کرتا ہوں کہ مسودہ بھیجنے کے لئے پیسے کہاں ہیں؟ ٹکٹ بغیر بھیج دوں ــ؟
بیوی: (ہنستی ہے) میں ٹکٹوں کا بھول ہی گئی تھی۔
مارکس: ایک ٹکٹ کہیں سے مل گیا تھا۔ سو اینجلز کو خط لکھا ہے اور اس سے کہا ہے کہ بھائی مسودہ روانہ کرنے کے لئے ٹکٹ چاہئیں۔ کچھ روانہ کردو۔ تاکہ یہ کام انکا نہ رہے (ہنستا ہے) حد ہوگئی ہے ــــ شاید ہی کوئی ایسا مصنف ہوگا جس نے دولت پر کتاب لکھی ہو اور وہ خود دولت سے محروم رہا ہو ــــ اس کتاب کی طباعت کا انتظام ہوجائے تو ارادہ ہے کہ انگریزی ریلوے کمپنی میں ملازم ہوجاؤں۔
بیوی: آپ سے یہ ملازمت نہ ہوسکے گی۔
مارکس: تو ایک صورت اور ہے، وہ یہ کہ اپنے آپ کو دیوالیہ اعلان کردوں۔ دو لڑکیاں ہیں۔ انہیں تم کسی امیر کے بچوں کو کھلانے کا کام دلوادو اور ہم تم دونوں کسی "ورک ہاؤس" میں چلے جائیں۔
بیوی: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟
مارکس: کیا کہہ رہا ہوں ــــ "ورک ہاؤس" ہم ایسے نادار انسانوں ہی کے لئے بنائے گئے ہیں ــ اور مارکس کی لڑکیوں اور ان کھلائیوں میں کیا فرق ہے

جو کئی متموّل گھرانوں میں نظر آتی ہیں۔

"ورک ہاؤس" میں جانے اور لڑکیوں کو کھلائی بنانے کی نوبت نہ آئی۔ کیونکہ سن اٹھارہ سو ساٹھ میں اینجلز کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وصیّت کی رو سے وُہ اپنے باپ کی فرم کا مالک بن گیا اور اس قابل ہو گیا کہ اپنے دوست مارکس کو زیادہ سے زیادہ مدد دے سکے ۔ اس دوران میں مارکس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس نے بھی کچھ ترکہ چھوڑا ۔ پھر مارکس کا دوست ولیم وُلف راہئ ملکِ عدم ہوا۔ اس نے بھی مارکس کے لئے کچھ چھوڑا۔ غرض یہ کہ مفلسی کا دور تھوڑے عرصہ کے لئے ختم ہوا ۔ اب فارغ البالی ہوئی تو اس نے ۱۸۶۴ء میں انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی۔ تمام دُنیا کے مزدوروں کی تنظیم آسان کام نہ تھا۔ مارکس کو اس سلسلہ میں بہت سردردی کرنی پڑی۔ چونکہ اس کام میں پڑ کر وُہ آمدنی کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا تھا۔ اسلئے مفلسی اور بیماری نے اس کے دروازے پر پھر دستک دی۔

بیوی :۔ مجھے آپ کے دوست اینجلز سے پورا پورا اتفاق ہے۔ اُن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ کم بخت کتاب "سرمایہ" ہی تمام آفتوں کا موجب ہوئی ہے۔

مارکس :۔ مگر اب تو میں اسے ختم کر چکا ہوں ۔ مجھے پوری پوری اُمید ہے کہ اس سال کے آخر تک میری مالی حالت بہتر ہو جائے گی۔ میں اپنے پیروں پر

کھڑا ہو جاؤں گا۔ مجھے دراصل افسوس اس بات کا ہے کہ میری وجہ سے بیچارہ اینجلز بہت پریشان رہا۔ میری خاطر اُسے کاروباری دُنیا میں بہت تندہی سے کام کرنا پڑا۔ سچ تو یہ ہے بیگم۔ اگر اینجلز امداد نہ کرتا تو یہ کتاب میں کبھی نہ لکھ سکتا۔

بیوی:۔ اب آپ نے پھر اُن کو تکلیف دی ہے۔

مارکس:۔ یقین جانو۔ اگر ازحد ضرورت نہ ہوتی تو میں اُسے کبھی تکلیف نہ دیتا۔ اپنی اُنگلیاں قلم کر دیتا جنہوں نے اس کو یہ خط لکھا اور امداد چاہی۔ دوسروں کو تکلیف دے کر زندگی کے دن پورے کرتے رہنا واقعی بہت بڑی ذلّت ہے لیکن یہ خیال اس ذلّت کو دور کر دیتا ہے کہ اینجلز اور میں دونوں ایک کام میں برابر کے شریک ہیں۔

بیوی:۔ آپ نے ایک بار کہا تھا کہ مزدوروں کی سی طرزِ رہائش اختیار کر لیں گے...

مارکس:۔ میں نے اس پر بہت غور کیا۔ تم خود اب میری اس رائے سے اتفاق کرو گی کہ بالکل مزدوروں کی سی طرزِ رہائش ہمارے موجودہ حالات میں مصلحت کے خلاف ہے۔ اگر دو جوان لڑکیوں کے بجائے دو لڑکے ہوتے تو بخدا مجھے ایسی رہائش اختیار کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوتا۔

بیوی:۔ آپ کی صحت بہت خراب ہو گئی ہے۔

مارکس:۔ نہیں تو۔

بیوی:۔ نہیں تو کیا۔ کئی بار آپ کہہ چکے ہیں کہ ٹانگوں میں بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر بھی آپ سے یہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی صحت بہت گر گئی ہے اب آپ خدا کے لئے رات کا کام بند کر دیجئے۔

مارکس:۔ رات کا کام بند کر دوں تو کھاؤں کہاں سے؟

بیوی:۔ یہی تو آفت ہے بغیر کام کئے ایک پیسہ بھی نہیں مل سکتا۔

مارکس:۔ کتاب چھپ جائے تو میرے سب دکھ درد دور ہو جائیں گے — اس صورت میں جب کہ مسودہ گھر میں پڑا ہے۔ میں موت کی خواہش بھی تو نہیں کر سکتا۔

بیوی:۔ کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں؟

مارکس:۔ وہ کتاب جس کے لئے میں نے اپنی صحت، اپنی خوشی اور اپنے بیوی بچوں تک کو قربان کر دیا۔ اگر میری موت کے بعد شائع ہو تو کیا مجھے افسوس نہ ہوگا — تم اچھی طرح جانتی ہو کہ بہت سے آدمی جو اپنے آپ کو عملی کہتے ہیں، میری اس علمی مشغولیت کو بے ثمر اور بیکار کہتے رہے ہیں — میں اُن کی اس بیوقوفی پر ہنستا رہا ہوں — یہ میری ہنسی صرف اسی صورت میں کامیاب ہوگی اگر یہ کتاب چھپ گئی۔

بیوی:۔ اصل میں یہی لوگ جو خود کو عملی آدمی کہتے ہیں۔ بہت بڑے بے عمل ہیں۔

مارکس:۔ اگر میں "سرمایہ" کو مرتب کئے بغیر مر جاتا تو اپنے آپ کو انہی بے عمل آدمیوں کے زمرے میں شمار کرتا۔ لیکن مجھ ایسے حساس انسان کے لئے۔ ناممکن تھا

کہ انسانیت کی چیخ سنتا اور خاموش رہتا۔ صرف وہی انسان دوسرے انسانوں کے دکھ درد سے بے پرواہ رہ سکتا ہے۔ جس کی کھال موٹی ہو۔

بیماری سے نجات حاصل ہوئی تو ۱۸۶۷ء میں کارل مارکس خود اپنی تصنیف "سرمایہ" کا مسودہ لے کر ہمبرگ گیا۔ ۱۶ اگست کو "سرمایہ" کی کاپیوں کی تصحیح کا کام ختم ہوا۔ پہلی جلد نکل آئی۔ دوسری اور تیسری جلد میں ترتیب و تنقیح کا کام ہوتا رہا مگر کارل مارکس کے ہاتھوں سے قدرت کو جو کام کرانا تھا۔ قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کی دنیا میں ضرورت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ پہلے اس کی رفیقۂ حیات کا ۲ دسمبر کو انتقال ہوا اور وہ خود ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء کو بوقتِ سہ پہر اس جہان سے رخصت ہوا۔ ۱۷ مارچ کو اسے دفن کیا گیا۔ اینجلز نے اس کی قبر پر تقریر کرتے ہوئے کہا

اینجلز:۔ ۱۴ مارچ سہ پہر کو پونے تین بجے دنیا کا سب سے بڑا دماغ اٹھ گیا۔ اس کی موت سے پرولتاریہ جدوجہد اور تاریخ کے نظریۂ واقعیت کو جو صدمہ پہنچا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ڈارون نے اگر قدرت کے ارتقا کا قانون دریافت کیا ہے تو مارکس نے سماج کے ارتقاء کا قانون دریافت کیا ہے۔ اس نے موجودہ سرمایہ دارانہ اور بورژوائی سماج کے محرکات بتائے ہیں۔ اس نے ہمیں سمجھایا ہے کہ انسان کو سیاست۔ علم۔ فن اور مذہب

کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے سے پہلے کھانے، پینے، پہننے اور رہنے کی
ضرورت ہوتی ہے اور ہر ملک کے دستور علوم وفنون۔ اصول وقانون
اور ایک حد تک اس کے باشندوں کی شریعت کے بنیادی اصول اُس کے
سماج کے اقتصادی حالات میں مضمر ہوتے ہیں اور اگر کسی ملک کے آئین و
قوانین اور مذہبی خیالات کی بابت معلوم کرنا ہو کہ وہ کیوں اور کس طرح پیدا ہوئے
تو اس ملک کی اقتصادی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہئے۔ کیونکہ زمانے کے اقتصادی
حالات ہی ان خیالات کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔

جون آف آرک کا مقدّمہ

جون آف آرک کے سوانحِ حیات سے تو قریب قریب آپ سب واقف ہونگے ۔ ۱۴۲۹ء میں فرانس کی حالت بہت بُری تھی ۔ انگلستان کی فوج فرانسیسی سپاہیوں کو شکست پر شکست دے رہی تھی ۔ ہر جگہ انگریزی فوج کا ڈنکا بج رہا تھا ۔ ہنری پنجم کی وفات کے بعد بھی حالات درست نہ ہوئے ۔ پیرس انگریزوں کے قبضے میں تھا ۔ چارلس ہفتم تخت سے بیدخل ہو گیا تھا ۔ اس کے حمایتی جی چھوڑ کے تتر بتر ہو گئے تھے اور لینز کے شہر کا محاصرہ ہوئے پانچ مہینے ہو چکے تھے ۔ قریب تھا کہ یہ انگریزوں کے ہاتھ میں چلا جائے ۔ کہ جون آف آرک، دیہات کی ایک سترہ سالہ لڑکی مردانہ وار آگے بڑھی ۔ سیدھی چارلس ہفتم شاہ فرانس کے پاس گئی ۔ اس سے کہنے لگی کہ مجھے خدا نے تیری مدد کے واسطے بھیجا ہے ۔ شروع شروع میں کسی نے اس کا اعتبار نہ کیا مگر کچھ دیر بعد اس نے فرانس کی مُردہ فوج میں نئی روح پھونک دی ۔ زرہ بکتر پہنے، ہاتھ میں جھنڈا اٹھائے، گھوڑے پر

سوار اُس نے کئی میدان جیتے ــــ اور لیتر کے شہر پر سے انگریزوں کا محاصرہ اٹھ گیا۔ اس کے بعد فتح و نصرت ہر قدم پر فرانسیسی سپاہیوں کے پاؤں چومنے لگی ــــ چند مہینوں کی لگاتار کوششوں کے بعد ۱۷ ر جولائی کو وہ چارلس ہفتم کی رسمِ تاجپوشی میں شریک تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جون آف آرک نے واپس دیہات چلے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر بادشاہِ فرانس نے قبول نہ کی اور اصرار کیا کہ وہ اس کے پاس ہی رہے پھر جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ انگریزوں کے قائم مقام ڈیوک آف بیڈفورڈ کی طاقت اور شاہِ فرانس کی سُستی اور کم ہمتی کے باعث حالات نے پلٹا کھایا۔ پیرس پر انگریزوں نے حملہ کیا جس میں جون آف آرک زخمی ہُوئی۔ ایک آدمی لبنارڈی وندوم نے اُسے گرفتار کر لیا۔ انگریز جو اس سے بہت خائف تھے اور پانچ ہزار جوانوں جتنا اہم سمجھتے تھے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ بیڈفورڈ اور لبنارڈی وندوم کے درمیان سودا شروع ہوا۔ بالآخر جون آف آرک ایک بہت بڑی قیمت پر فروخت ہو کر انگریزوں کے ہاتھ آگئی۔ روؤن کے قلعے میں بھاری زنجیریں پہنا کر اُسے قید کر دیا گیا ــــ تقریباً ایک سال تک اٹھارہ انیس برس کی یہ لڑکی پا بزنجیر رہی۔ اس کے بعد مذہبی عدالت میں انگریزوں کے ایماء سے اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اُس کا کوئی وکیل نہیں تھا۔ کلیساؤں کے پادری، لاٹ پادری، بشپ، مفتی، علم دینیات کے بڑے بڑے ماہرین اور قانون دان جن کی تعداد پچانوے تک پہنچی ہے اُس کے منصف تھے۔

مقدمے کا آغاز

بشپ: ۔ جون آف آرک ، گاسپل پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ ۔ کہ جو سوال تم سے کئے جائیں گے ۔ تم اُن کا صحیح جواب دو گی اور سچ بولو گی ۔

جون آف آرک: ۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں قسم نہ کھاؤں ۔

بشپ: ۔ تمہیں کس نے حکم دیا ہے ؟

جون: ۔ خدا نے ۔ میرے کانوں میں آواز آئی ہے کہ میں قسم نہ کھاؤں ۔ اور پھر مجھے یہ بھی تو معلوم نہیں کہ مجھ سے کیا کیا سوال کئے جائیں گے ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ مجھ سے ایسی باتیں پوچھیں ۔ جن کا جواب دینا میں مناسب خیال نہ کروں

بشپ: ۔ تمہیں سچ بولنے کے لئے حلف اٹھانا ہوگا ۔

جون: ۔ فرانس میں آ کر میں نے کیا کچھ کیا ۔ میرے ماں باپ کون تھے ۔ اگر آپ ایسی باتیں پوچھیں تو میں حلف اُٹھانے کے لئے تیار ہوں ۔ لیکن خدا کی طرف سے مجھے کیا الہامات وصول ہوئے ۔ اس کے بارے میں آپ کو سچی باتیں بتانے کے لئے میں کبھی حلف نہیں اٹھاؤں گی ۔ خواہ میری جان ہی چلی جائے ۔ الہامات کے متعلق میں نے صرف اپنے بادشاہ چارلس سے بات چیت کی ہے اور کسی سے نہیں ۔

بشپ: ۔ تمہاری عمر کیا ہے ؟

جون: ۔میرے خیال میں اُنیس برس کی۔

بشپ: ۔تم نے دینی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

جون: ۔اپنے ماں باپ سے۔

بشپ: ۔دُعا سناؤ۔

جون: ۔(طنز کے ساتھ) اس وقت سُن لیجئے گا جب میں اعترافِ گناہ کروں گی۔

بشپ: ۔اعترافِ گناہ کا موقعہ اب تمہیں نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ آئندہ تمہیں گرجا جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

جون: ۔کیوں؟

بشپ: ۔اس لئے کہ تم بے دینی اور الحاد کے الزام میں گرفتار رہو۔

جون: ۔مجھے یہ پابندی منظور نہیں — اور پھر میرے پاؤں میں یہ زنجیریں کیوں باندھی جاتی ہیں۔

بشپ: ۔اس لئے کہ تم فرار نہ ہو سکو۔

روُدن کے قلعے میں جون آف آرک جس کی عُمر اُنیس برس سے زیادہ نہ تھی قید تھی اُس کے پاؤں میں ہر وقت لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں رہتی تھیں تاکہ وہ بھاگ نہ سکے۔ پہرے پر تین انگریز فوجی افسر متعین تھے — مقدمے کی پہلی سماعت ۲۲ر فروری کو ہوئی تھی، دوسرے سماعت دوسرے ہی روز ہوئی۔ ایک بار پھر اس سے

کو سیسل پر دونو ہاتھ رکھ کے حلف اٹھانے کو کہا گیا۔ پہلے تو اس نے انکار کیا مگر بعد میں بدرجۂ مجبوری اُس نے یہ حلف اُٹھا لیا۔ سوالات شروع ہوئے۔

جین :۔ بچپن میں تمہارے کیا شغل تھے ؟

جون :۔ سینا پرونا اور چرخہ کاتنا ۔۔ زیادہ تر میں گھر میں رہتی تھی اور باہر کھیتوں میں بہت کم جاتی تھی۔

بشپ :۔ سینا پرونا تم کیسا جانتی ہو ؟

جون :۔ شہر بھر میں ایسی کوئی عورت نہیں جو سینے پرونے میں میرا مقابلہ کر سکے۔

جین :۔ سب سے پہلی الہامی آواز تمھیں کب سُنائی دی۔

جون :۔ جب میں تیرہ برس کی تھی۔

جین :۔ یہ آواز کس کی تھی ؟

جون :۔ خدا کی ۔۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں پاک زندگی بسر کروں ۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں اپنے باپ کے باغ میں کھڑی تھی، جب مجھے یہ آواز سُنائی دی ۔۔ میں ڈر گئی تھی۔

دینیات کا ماہر :۔ یہ آواز تمھیں کس طرف سے سنائی دی تھی۔ دائیں طرف سے یا بائیں طرف سے۔

جون :۔ دائیں طرف سے۔ آواز سے پہلے مجھے روشنی دکھائی دی تھی۔

دینیات کا ماہر :۔ ہوں . . . تمہاری نجات کے لئے اس آواز نے تمہیں کیا ہدایات

دی تھیں۔

جون:۔ یہ آواز مجھ سے کہتی تھی کہ میں نیک اور پاک زندگی بسر کروں۔ چرچ جایا کروں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فرانس جاؤں۔

جبین: شنون کے قلعے میں بادشاہ سے ملاقات کرنے کے لئے بھی اسی آواز نے تمہیں حکم دیا تھا۔

جون:۔ اسی آواز نے۔ چونکہ بشارت ہوئی تھی۔ اس لئے بادشاہ کو میں نے فوراً پہچان لیا۔

جبین:۔ بشارت کے وقت بھی کیا تمہیں روشنی نظر آئی تھی؟

جون:۔ مجھے یاد نہیں۔

دینیات کا ماہر:۔ بشارت میں جب تم نے اپنے بادشاہ کو دیکھا! تو کیا اُس کے سر پر کسی فرشتے کا سایہ تھا۔

جون:۔ میں اس کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں۔

جبین:۔ یہ الہامی آوازیں کیا تم اکثر سُنتی ہو۔

جون:۔ ہر روز سنتی ہوں —— یہی آوازیں تو میری تسکین کا باعث ہیں۔

اسی طرح کے سوالات اُس پر مقدمے کی تیسری سماعت میں کئے گئے۔ ایک وقت میں کئی آدمی اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے تھے مگر کہتے ہیں کہ وہ مطلق

گھبراتی نہیں تھی۔ اُس کو جادوگرنی، کافر اور ملحد ثابت کرنے کے لئے یہ عدالت بٹھائی گئی تھی۔ اس لئے ہر منصف کی یہی کوشش تھی کہ جون کے بیانات سے وُہ تمام الزامات ثابت ہو جائیں جو اُس پر لگائے گئے تھے۔ یہ کہ اُس نے الہامی آوازوں کا ڈھونگ رچا کر کلیسا اور مذہب کی بے حرمتی کی اور ہزاروں انسانوں کا خون بہایا۔ مقدمے کی تیسری سماعت میں باسٹھ اسیسر تھے۔ چوتھی سماعت سے ایک روز پہلے وُہ بیمار ہو گئی۔ جس پر شاہِ انگلستان کو سخت فکر لاحق ہوئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جون بیماری سے مر جائے۔ وہ اس کی موت قانون کے ہاتھ سے چاہتا تھا۔ چنانچہ جون کا علاج کیا گیا۔ جب وہ تندرست ہوئی تو پھر سوالات کا وہی سلسلہ شروع ہُوا۔

بشپ :۔ کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتی ہو کہ پریاں بد ارواح ہیں۔

جون :۔ مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

بشپ :۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ ــــ کیا سینٹ کیتھرین اور سینٹ مارگریٹ کو انگریزوں سے نفرت ہے؟

جون :۔ اُن کو صرف انہی چیزوں سے پیار ہے جو ہمارے رسول کو پیاری ہیں اور وُہ اُن تمام چیزوں سے نفرت کرتے ہیں۔ جن سے خدا نفرت کرتا ہے۔

جیئن :۔ کیا خدا انگریزوں سے نفرت کرتا ہے؟

جون :۔ خدا انگریزوں سے نفرت کرتا ہے یا محبت۔ اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم

نہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ سب انگریز فرانس سے باہر نکال دیے جائیں گے۔ سوائے ان کے جو یہاں مریں گے اور یہ کہ خدا فرانس کو فتح اور انگریزوں کو شکست دے گا۔

بشپ:۔ کیا خدا اس وقت انگریزوں کے حق میں تھا جب وہ فرانس میں پھول پھل رہے تھے۔

جون:۔ مجھے معلوم نہیں کہ خدا کس کے حق میں تھا۔ لیکن میرا ایمان یہ ہے کہ خدا نے ان کو ان کے گناہوں کی سزا دی۔

دینیات کا ماہر:۔ اگر تم شادی شدہ ہوتیں تو کیا تمہیں الہامی آوازیں سنائی دیتیں؟

جون:۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔

لارڈ بشپ:۔ جون — یہ سب لوگ جو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں، صاحبِ علم و فضل ہیں۔ دینیات کے ماہر ہیں۔ ان سب پر یہ فرض عائد ہے کہ وہ کمال مہربانی اور شفقت سے کسی انتقامی جذبے کو اپنے دل میں جگہ دیئے بغیر تمہیں گمراہی سے بچائیں اور نیکی کا صحیح راستہ بتائیں۔ چونکہ تم ان پڑھ ہو اور دینی علوم سے تمہیں زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ اس لئے ہم تمہیں اپنے درمیان میں سے ایک وکیل دینے کے لئے تیار ہیں جس سے تم مشورہ لے سکو گی۔ اگر تم خود ہم میں سے کوئی آدمی اس کام کے لئے منتخب نہ کرو گی تو ہمیں خود یہ انتخاب کرنا پڑے گا۔ بولو اس بارے میں تم کیا کہتی ہو؟

جون :۔ میں آپ کی اس عنایت کی شکر گزار ہوں ۔ آپ کے علاوہ ان سب کی بھی ممنون و متشکر ہوں جو میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ لیکن مجھے کسی وکیل کی ضرورت نہیں ۔ اس لئے کہ میں اپنے رسول کے مشوروں سے مُنہ موڑنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی الہامی آوازوں کو اس وکیل پر ترجیح دیتی ہوں۔

سارے مقدمے کی تفصیل بیان کرنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ قصّہ مختصر یہ ہے کہ انصاف کرنے والے جو نا انصافی کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ ایک عرصے تک دیہات کی اس بہادر اور نڈر لڑکی سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ جب اُس کے بیانات ختم ہوئے تو اس کے خلاف بے شمار جرائم کی فہرست تیار کی گئی۔ اُس کو دھمکیاں دی گئیں۔ اُس سے جھوٹے وعدے بھی کئے گئے کہ اگر وُہ اعلانیہ طور پر خود کو تائب ظاہر کرے تو سزا میں رعایت کر دی جائے گی۔ آخر عورت ذات تھی۔ ایک برس کی قید کی تکلیفوں ساٹھ ساٹھ ستّر ستّر آدمیوں کی جرح نے اور پاؤں کی زنجیروں نے اُس بیچاری کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ موت سے کون خوف نہیں کھاتا اور پھر وہ موت جو آگ میں جل کر نصیب ہو۔ کتنی ہولناک ہے۔ جون نے ڈر کے مارے منصفوں کے کہنے پر اپنے تائب ہونے کا اعلان کر دیا۔ سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی اور اُس سے وعدہ کیا گیا کہ اُس کو باقاعدہ نماز پڑھنے کی اجازت مل جائے گی مگر شاہِ انگلستان اس فیصلے سے کیسے مطمئن ہو سکتا تھا۔ چنانچہ

ایک چال چلی گئی۔ قید خانے سے عورتوں کا لباس ہٹا لیا گیا۔

بشپ :۔ تم نے پھر مردوں کا لباس پہن لیا ہے ؟
جون :۔ میں نے اپنی مرضی سے پہنا ہے۔ اس کے لئے کہ میرے خیال کے مطابق اس وقت یہی لباس بہتر ہے۔
بشپ :۔ تم نے اتنے آدمیوں کے سامنے قسم کھائی تھی کہ تم پھر کبھی یہ لباس نہ پہنوگی
جون :۔ میرا ہر گز یہ منشا نہیں تھا کہ یہ لباس ترک کرنے کی قسم کھاؤں۔
بشپ :۔ سوال یہ ہے کہ تم نے مردوں کا لباس کیوں پہنا؟
جون :۔ اس لئے پہنا ہے کہ اس وقت یہی موزوں و مناسب ہے۔ اس لئے کہ میں مردوں کے درمیان رہتی ہوں۔ میں نے یہ لباس اس لئے پھر اختیار کیا ہے کہ مجھ سے جو وعدے کئے گئے تھے۔ پورے نہیں ہوئے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ مجھے گرجے میں جانے کی اجازت دی جائے گی اور میرے پاؤں کی زنجیریں ہٹالی جائینگی مگر کچھ بھی تو نہیں ہوا۔
بشپ :۔ تائب ہوتے وقت کیا تم نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ یہ لباس ترک کر دو گی۔
جون :۔ اگر آپ میری زنجیریں جدا کر دیں۔ مجھے کسی اچھے قید خانے میں رکھیں اور میرے ساتھ کسی عورت کے رہنے کا انتظام کریں تو میں یہ لباس اتار دونگی۔
بشپ :۔ کیا تم نے تائب ہونے کے بعد بھی الہامی آوازیں سُنی ہیں۔

جون :۔ سُنی ہیں ۔

بشپ :۔ کیا کہا گیا ہے تُم سے ؟

جون :۔ مجھ سے خُدا نے سینٹ کیتھرائن کے ذریعے سے یہ کہلوایا ہے کہ میں نے تائب ہونے میں سخت غلطی کی ہے ۔ جان بچانے کے لئے میں نے اپنی روح کو پستیوں میں گرادیا ہے ۔۔۔ لیکن میں کیا کرتی ۔ میں اس وقت ڈر گئی تھی ۔ اگر میں کہتی کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے تو مجھے آگ میں جھونک دیا جاتا ۔۔۔ لیکن سچی بات یہی ہے کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے ۔۔۔ اور خدا نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کا کھلم کھلا اعلان کرنے سے خائف ہو کر میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے جو مجھے نہیں کرنا چاہیئے تھا ۔

بشپ :۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ آواز سینٹ کیتھرین کی تھی ؟

جون :۔ مجھے اس کا یقین ہے اور میں اس پر بھی ایمان رکھتی ہوں کہ یہ آوازیں خدا کی طرف سے آتی ہیں ۔

بشپ :۔ تائب ہوتے وقت تم نے ہزارہا آدمیوں کے سامنے مانا تھا کہ ان آوازوں کے متعلق تم نے جھوٹ بولا تھا ۔

جون :۔ میں نے اُس وقت جو کچھ کہا ۔ آگ سے ڈر کر کہا ۔ لیکن میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی جو خدا یا مذہب کے خلاف ہو ۔ اگر آپ لوگوں کی اسی میں خوشی ہے کہ میں زنانہ لباس پہنا کروں تو میں یہی لباس پہن لیا کروں گی ۔ لیکن اس کے

سوا میں اور کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔

بشپ :۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ آوازیں جو تمہیں سنائی دیتی ہیں، نیک ارواح کی ہیں یا بدارواح کی؟

جون :۔ مجھے معلوم نہیں۔ خدا بہتر جانتا ہے۔

دوسرا پادری :۔ کیا آوازیں سچ مچ حقیقی ہوتی ہیں؟

جون :۔ حقیقی ہوں یا مصنوعی، مجھے سنائی دیتی ہیں نیک ارواح کی ہوتی ہیں یا بدارواح کی؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

بشپ :۔ ہمارا خیال ہے کہ دراصل ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

دوسرا پادری :۔ تم غور کرو کہ یہ آوازیں تم سے کئی بار کہہ چکی ہیں کہ اس مقدمے سے تم بری جاؤ گی مگر تم بری نہیں ہوئیں۔

بشپ :۔ ان آوازوں نے اس دوران میں تم سے کئی وعدے کئے ہیں۔ سچ سچ کہو۔ ان میں سے کوئی پورا ہوا ہے؟

دوسرا پادری :۔ یہ تمہارا وہم تھا۔

بشپ :۔ ممکن ہے بدارواح نے تمہیں گمراہ کیا ہو۔

دوسرا پادری :۔ تمہیں غور کرنا چاہئے۔ سوچنا چاہئے۔

جون (گھبرا کر) مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری موت کے باعث آپ ہی ہونگے۔

بشپ :۔ جون! انجام جو کچھ بھی ہو گا تمہیں صبر کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا۔

سزائے موت تمہیں صرف اس لئے ملے گی کہ تم اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی ہو۔

دوسرا پادری :۔ جو کہ سب سے بڑا جرم ہے خدا کا اور کلیسا کا۔

بشپ :۔ جون، اب سوچو کہ تمہاری آوازیں کدھر گئیں ۔ ان سے تمہیں کیا فائدہ پہنچا ہے ۔ یہ تمہیں موت کے منہ سے بچا سکتی ہیں ؟ ــــ میں سمجھتا ہوں کبھی نہیں ۔ کیا ان آوازوں نے تمہیں صریحاً دھوکا نہیں دیا ؟

جون :۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے ۔

بشپ :۔ بظاہر نہیں، حقیقت میں ان آوازوں نے تمہیں دھوکا دیا ہے ــــ کیا اب بھی تمہیں ان کی صحت پر یقین ہے ۔

جون :۔ مجھے اب سوائے خدا کے اور کسی پر یقین نہیں ۔

بشپ :۔ شاباش ۔

دوسرا پادری :۔ کیا ان آوازوں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا ؟

جون :۔ دیا ہے ۔

دوسرا پادری :۔ شاباش ۔

اُنیس برس کی ناتواں لڑکی پر بالآخر اُس کے منصفوں نے فتح پالی ۔ چنانچہ جون دوسرے روز صبح نو بجے اُس قید خانے سے نکالی گئی ۔ جہاں اُس نے ایک سو اٹھ

دن جسمانی اور روحانی اذیتوں میں گذارے تھے۔ اس کو ایک چھکڑے میں بیٹھایا گیا اور اسے ہتھیار بند فوجیوں کے پہرے میں وہ پرانی منڈی کے چوک میں لائی گئی جہاں تین بڑے بڑے مچان تیار کئے گئے تھے۔ ایک چبوترے پر پادری وغیرہ بیٹھے تھے۔ جنہیں فیصلہ سنانا تھا۔ دوسرے چبوترے پر جون کو کھڑا کیا گیا۔ تیسرے چبوترے پر جو چونے اور گچ کا بنا ہوا تھا۔ چوک کے عین درمیان تھا۔ اس پر ایندھن کا ایک انبار لگا تھا۔ چوک میں اتنے تماشائی جمع تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ بہت بڑے میلے کا سماں تھا۔ چھتوں پر اکھڑکیوں میں ہر جگہ تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے ۔۔ فیصلہ سُنایا گیا۔

بشپ :۔ ہم فتویٰ دیتے ہیں کہ تم ایک گمراہ اور ملحد عورت ہو۔ اس خیال سے کہ تم دوسرے عیسائیوں کو گمراہی اور الحاد کا راستہ نہ دکھاؤ۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں چرچ کے رشتے سے منقطع کر دیا جائے اور تمہیں عام انسانی عدالت کے حوالے کر دیا جائے ۔ ہم تمہیں مذہب سے علیحدہ کر رہے ہیں۔ تم پر بے دینی کا فتوے عائد کرتے ہیں اور عام انسانی عدالت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ سزا دیتے وقت تم پر رحم کرے

جون :۔ (ہنستے ہوئے) مجھے اب ان تمام آدمیوں سے جو میرے ارد گرد جمع ہیں۔ رحم کی درخواست کرنا ہوگی ۔۔۔۔ ان لوگوں سے جو ہنس کھیل رہے ہیں۔

بشپ :۔ انہی لوگوں کے ہاتھ میں اب تمہاری قسمت کا فیصلہ ہے۔

جون :- میری قسمت !.... (روتے ہوئے مگر بلند آواز میں) میری قسمت کا فیصلہ کرنے والو دیکھو میں زانوؤں پر گر کر تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے معاف کر دو.... اگر میں نے تمہیں دکھ پہنچایا ہے تو میں اس کے لئے معافی مانگتی ہوں.... میرے فرانسیسی بھائیو میں پہلے تم سے مخاطب ہونا چاہتی ہوں.... اگر میرے دل میں وطن کی محبت نہیں ہے، اگر میرے افعال سے فرانس کو اور تم کو جو اس کے فرزند ہو کوئی نقصان پہنچا ہے تو مجھے معاف کر دو.... میں سچ کہتی ہوں کہ تمہارا بادشاہ بالکل بے گناہ ہے.... جو کچھ میں نے کیا ہے۔ اس کی ذمہ دار صرف میں ہوں۔ وہ بالکل بے قصور ہے — مجرم میں ہوں.... میں جو اس وقت لاکھوں آدمیوں کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہوں۔ میں نے فوجوں کی کمان سنبھالی ہے، میں نے تلواروں اور تیروں کی چھاؤں میں کئی کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ لیکن اس وقت میں تمہارے رحم وکرم پر ہوں — اگر مجھے الہامی آوازیں سننے میں دھوکا ہوا ہے تو مجھے معاف کر دو.... میرے بھائیو.... تم سب فرانس سے محبت کرتے ہو.... میرا خیال تھا کہ مجھے بھی فرانس سے محبت ہے.... تم کہو تو میں ماننے کے لئے تیار ہوں کہ مجھے فرانس سے محبت نہیں تھی، میں نے اس سے غداری کی.... میں یہ سب کچھ ماننے کے لئے تیار ہوں — لیکن مجھے معاف کر دو.... میں سب سے معافی مانگتی ہوں، انگریزوں سے جنہیں میں اپنے وطن کا دشمن سمجھتی رہی ہوں.... اُن سپاہیوں سے جو میرے جھنڈے تلے ان انگریزوں سے لڑتے

رہے ہیں — میں سب سے گڑگڑا کے معافی مانگتی ہوں.... پادریوں مفتیوں، اور دینیات کے ماہروں سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ میری نجات کے لئے دعا مانگیں.....

تقریباً آدھے گھنٹے تک جون آنکھوں میں آنسو لئے اس طرح گڑگڑا کر تماشائیوں سے معافی مانگتی رہی۔ لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اسے دوسرے چبوترے پر کھڑا کر کے اردگرد ایندھن کی لکڑیاں چُن دی گئیں۔ کہتے ہیں کہ اُس نے ایک انگریز سے جو اُس کے پاس ہی چبوترے پر کھڑا تھا۔ صلیب مانگی۔ اُس انگریز نے دو تنکے جوڑ کر صلیب بنائی اور جون کو دے دی۔ جون نے یہ صلیب اپنے سینے کے ساتھ لگالی — ایندھن کو آگ دکھائی گئی۔ خشک لکڑیاں چیخ چیخ کر اس ظلم کی فریاد کرنے لگیں گاڑھے دھوئیں نے کنواری جون کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ چھ مرتبہ اُس نے "یسوع مسیح" کہا.... اس کے بعد کوئی آواز اُس کی چتا سے نہ آئی...

انصاف

دروازہ کھلتا ہے۔ چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار:۔ با ادب، با ملاحظہ، ہشیار، نظریں روبرو، شہنشاہِ عالم لنچ کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہِ عالم کے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ تشریف لاتے ہیں

شہنشاہ:۔ ہیڈ بٹلر کہاں ہے؟

چوبدار ایک بہت بڑی ڈش پر سے سرپوش اٹھاتا ہے۔ ہیڈ بٹلر پھدک کر باہر نکلتا ہے اور عرشی سلام کرتا ہے۔

ہیڈ بٹلر:۔ غلام سیلوٹ بجا لاتا ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ :- دسترخوان پر آج مابدولت کے لئے کیا کیا چیز حاضر ہے ؟

ہیڈ بٹلر :- گوشت پلاؤ، ماہی پلاؤ، مٹر پلاؤ، نارنگی پلاؤ، تنجن، بریانی، زردہ روغن جوش، قورمہ، ٹماٹر گوشت، بھنڈی گوشت، مٹر گوشت، پائے کا شوربہ قیمہ، بھیجا، چکن کٹلس، پوٹیٹو کٹلس، مٹن کٹلس، چکن چاپس، مٹن چاپس، پوٹیٹو چاپس، اور خدا جہاں پناہ کا بھلا کرے — ارہر کی دال۔

شہنشاہ :- (غصے میں) ارہر کی دال مابدولت کو بالکل پسند نہیں۔

ہیڈ بٹلر :- یور میجسٹی — آج لنچ پر تین اشتراکی ولایتوں کے وزیراعظم مدعو ہیں اس لئے .....

شہنشاہ :- (خوش ہوکر) مابدولت تمہاری فراست کی داد دیتے ہیں اور خوش ہوکر تمہارا منہ موتیوں سے بھر دینے کا حکم جاری کرتے ہیں۔

ہیڈ بٹلر :- میری سانس رک جائے گی عالم پناہ

شہنشاہ :- (مسکرا کر) تم بہت ذہین ہو — اچھا مابدولت تمہیں بسر کا خطاب عنایت کرتے ہیں۔

ہیڈ بٹلر :- جہاں پناہ کی اس قدر افزائی نے ذرّے کو آفتاب بنا دیا۔

شہنشاہ :- اور کس صفائی سے — ہینگ لگی نہ پھٹکری۔

ہیڈ بٹلر :- غلام سیلوٹ بجا لاتا ہے، یور میجسٹی۔

دروازہ کھلتا ہے۔ چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا

کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے

چوبدار:۔ باادب، باملاحظہ ہوشیار، نظریں روبرو، باادب باملاحظہ ہوشیار نظریں روبرو۔ ملکۂ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

چھوٹے چھوٹے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ ملکۂ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکہ:۔ جہاں پناہ کو زیادہ دیر تو میرا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں اپنی خادماؤں کے سر میں جوئیں ڈلوا رہی تھی۔

شہنشاہ:۔ کیوں؟

ملکہ:۔ رعایا کے لئے میں ایک بلڈ بینک کھولنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔

شہنشاہ:۔ امورِ سلطنت سے تمہاری یہ دلچسپی مابدولت کے لئے باعثِ مسرت ہوئی....

ہیڈ بٹلر:۔ رعایا کتنی خوش نصیب ہے کہ آپ ایسا مخلص بادشاہ اور آپ ایسی مخلص ملکہ اس پر حکمران ہیں۔

شہنشاہ:۔ پہلے یونہی مشہور تھا کہ فلاں بادشاہ کے راج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ لیکن ہمارے راج میں ایسے کئی گھاٹ موجود ہیں۔ جہاں شیر اور بکریاں اکٹھے پانی پیتے ہیں اور اس کو حلقۂ امکان میں لانے کے لئے مابدولت کو تمام شیروں کے دانت نکلوانے اور تمام بکریوں کے سینگ کٹوانے پڑے۔

ہیڈ بٹلر :۔ اس میں کیا شک ہے

گھنٹی کی آواز بلند ہوتی ہے

شہنشاہ :۔ (چونک کر) یہ کس نے ہمیں بُلایا ۔ یہ کون فریادی ہے جس نے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر کو جنبش دی؟

ملکہ :۔ جہاں پناہ کیا اسی وقت تشریف لے جائیں گے۔

شہنشاہ :۔ اسی وقت، اسی گھڑی۔ جب تک ہم اس فریادی کی فریاد نہیں سن لیں گے ادہر کی دال ہم پر حرام ہے۔ ہم ابھی جھروکے میں جاکر فریادی سے ملاقات کریں گے ۔ ضرور کسی انسان پر ظلم ہوا ہے۔

چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے

چوبدار :۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار، نظریں روبرو۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار نظریں روبرو ۔ شہنشاہ عالم فریادی کی فریاد سننے کے لئے تشریف لارہے ہیں

شہنشاہ، ملکہ، اور ہیڈ بٹلر تینوں باہر جھروکے میں تشریف لے جاتے ہیں

شہنشاہ :۔ یہ کون تھا جس نے ہمارے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر ہلائی اور ہمارا انصاف چاہا۔

فریادی :۔ یہ غلام انصاف کا طالب ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ :۔ تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا فریادی ۔ دُودھ کا دُودھ

اور پانی کا پانی الگ کرنا ہمارا کام ہے۔

فریادی:۔عالم پناہ، آج کل ایک سیر دودھ میں صرف دو قطرے دودھ کے ہوتے ہیں۔ باقی سب پانی ہوتا ہے۔

شہنشاہ:۔مطمئن رہو فریادی — دودھ کے یہ دو قطرے ہی علیحدہ کر کے دکھا دیئے جائیں گے — بولو، بے خوف و خطر ہو کر بولو کہ تمہیں کس نے دُکھ پہنچایا ہے — کیا ملکۂ عالم کے پستول سے تمہاری بیوی.....؟

فریادی:۔نہیں عالی جاہ — ملکۂ عالم کے پستول سے میری بیوی ہلاک نہیں ہوئی۔

شہنشاہ:۔تاریخ نے خود کو نہیں دُہرایا — یہ بھی ایک بہت بڑی بات ہے — بولو، تم کام کیا کرتے ہو؟

فریادی:۔عالم پناہ کے سائے تلے اس غلام نے ایک بہت بڑی لانڈری کھول رکھی ہے۔

شہنشاہ:۔کپڑے گھاٹ پر تم خود دھوتے ہو؟

فریادی:۔نہیں عالم پناہ — یہ ذلیل کام میں نے دوسروں کے سپرد کر رکھا ہے

شہنشاہ:۔ایسا ہی ہونا چاہئے — اب بتاؤ تمہیں کیا دکھ پہنچا ہے؟

فریادی:۔جہاں پناہ مجھے بہت بڑا دکھ پہنچا ہے — میرے پاس الفاظ نہیں جو میں بیان کر سکوں۔

شہنشاہ:۔ہوں (تھوڑی دیر غور و فکر کرنے کے بعد) فریادی تم کوئی فکر نہ کرو۔

ہم الفاظ کا بندوبست کئے دیتے ہیں ۔ ہیڈ بٹلر؟

ہیڈ بٹلر:۔ غلام حاضر ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ:۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا۔ ہم نے سر کے خطاب سے تمہیں سرفراز کیا تھا۔

ہیڈ بٹلر:۔ غلام اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کر چکا ہے۔

شہنشاہ:۔ اب خود کو اس قدر افزائی کا حق دار ثابت کرو... ہم تمہیں وزیرِ الفاظ کا رتبہ بخشتے ہیں۔ تاکہ تم اس فریادی کی فریاد کو مناسب و موزوں الفاظ میں ترتیب دے کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔

ہیڈ بٹلر:۔ غلام اس فرض سے سبکدوش ہونے کی پوری پوری کوشش کرے گا

شہنشاہ:۔ تم مطمئن ہو فریادی؟

فریادی:۔ میں بالکل مطمئن ہوں عالم پناہ۔

شہنشاہ:۔ وزیرِ الفاظ جاؤ، فریادی کی فریاد ایک رپورٹ کی صورت میں پیش کرو۔

ہیڈ بٹلر:۔ کام کی اہمیت کے پیشِ نظر غلام ایک ماہ کی مہلت کے لئے درخواست کرتا ہے۔

شہنشاہ:۔ بدولت دو ماہ کی مہلت عطا فرماتے ہیں۔

ہیڈ بٹلر:۔ شکریہ!

فریادی:۔ شکریہ!

دروازہ کھلتا ہے — چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے
اور اعلان کرتا ہے

چوبدار :۔ با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں روبرو — با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں روبرو — شہنشاہِ عالم دو مہینے کے بعد لانڈری والے کیس کے متعلق ہیڈ بٹلر المعروف وزیرِ الفاظ کی رپورٹ سننے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ جھروکے میں تشریف لاتے ہیں

شہنشاہ :۔ وزیرِ الفاظ، لانڈری والے فریادی کی رپورٹ مناسب و موزوں الفاظ میں تیار ہوئی ؟

ہیڈ بٹلر :۔ دو مہینے کی مسلسل محنت و مشقت اور عرق ریزی کے بعد یہ ہیچمدان ایک کروڑ الفاظ کی رپورٹ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو پبلک کی آگاہی کے لئے سرکاری پریس میں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہے۔

شہنشاہ :۔ فریادی — وزیرِ الفاظ کے اس کام سے کیا تم مطمئن ہو ؟

فریادی :۔ قطعی طور پر عالی جاہ — کام بڑے سلیقے سے ہو رہا ہے۔

شہنشاہ :۔ وزیرِ الفاظ - ہم تھوڑے عرصے کے لئے تمہیں وزیرِ خلاصہ بنا کر اس رپورٹ کا ملخص پوچھنا چاہتے ہیں جو پبلک کی آگاہی کے لئے سرکاری پریس میں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہے۔

ہیڈ بٹلر:۔ رپورٹ کا اصلی خلاصہ یہ ہے عالم پناہ — فریادی ایک بہت بڑی لانڈری کا مالک ہے۔ اس بہت بڑی لانڈری میں تمام کپڑے صابن سے نہیں کسی اور ہی چیز سے دھوئے جاتے ہیں جس کا نسخہ صرف فریادی ہی کو معلوم ہے۔

فریادی:۔ یہ نسخہ سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے عالم پناہ۔

شہنشاہ:۔ خوب!

ہیڈ بٹلر:۔ ڈرائی کلیننگ کے کام میں بھی فریادی پٹرول استعمال نہیں کرتا۔

فریادی:۔ غلام، پٹرول کا سارا کوٹہ بلیک مارکٹ میں بیچ دیتا ہے۔

شہنشاہ:۔ بہت خوب!

ہیڈ بٹلر:۔ فریادی کی لانڈری میں ساڑھے سات سو دھوبی کام کرتے ہیں۔ ان کو سینہ بسینہ چلنے والے اصولوں کے پیشِ نظر وہی تنخواہ ملتی ہے جو مغلیہ بادشاہوں کے عہد میں دھوبیوں کو ملا کرتی تھی۔ فریادی نے چار مہینے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے یہ تنخواہ پانے والے ملازم اُس کا صابن کھا رہے ہیں۔

شہنشاہ:۔ فریادی نے یہ کیسے محسوس کیا؟

فریادی:۔ اُن کا رنگ دن بدن اُجلا ہو رہا تھا جہاں پناہ۔

شہنشاہ:۔ درست۔

ہیڈ بٹلر:۔ اُنہوں نے صابن کھانے ہی پر اکتفا نہ کی — اس غریب کا پٹرول پینا بھی شروع کر دیا۔

شہنشاہ:۔ فریادی، پٹرول پینے کے متعلق تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

فریادی: عالم پناہ ۔ ان کی دھوآں دھار تقریروں نے غمازی کی۔

شہنشاہ: درست۔

ہیڈ بٹلر:۔ اپنے تنخواہ پانے والے ملازمین کی اس بلانوری اور بلانوشی سے تنگ آکر فریادی نے ایک روز کپڑے سکھانے کیلئے ان کو اس میدان کی طرف روانہ کر دیا جہاں شہزادیاں چاندماری سیکھتی ہیں۔

شہنشاہ:۔ (فکرمند ہو کر) والاشان شہزادیوں نے ان بے گناہوں کو ہلاک کر دیا؟

ہیڈ بٹلر: ایسا ہی ہوا جہاں پناہ... شہزادیوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ وُہ ساڑھے سات سو دھوبی جنگلی انسانوں کی وہ کھیپ ہے جو والاشان شہزادیوں کا نشانہ درست کرنے کے لئے عالم پناہ کے احکام کے مطابق ہر ہفتے فراہم کی جاتی ہے

شہنشاہ: دھوبیوں اور جنگلی انسانوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ہیڈ بٹلر: عالم پناہ کا ارشاد بالکل صحیح ہے ۔ ساڑھے سات سو دھوبیوں کے لواحقین چنانچہ فریادی کو اُن کی ہلاکت کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔

فریادی:۔ فریادی کا قصور صرف اتنا ہے جہاں پناہ کہ اُس نے تنگ آکر اُن کو اُس میدان کی طرف روانہ کر دیا۔ جہاں والاشان شہزادیاں نشانہ درست کرتی ہیں.... لیکن ان کی افسوسناک ہلاکت کے بعد جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ غیر ارادی طور پر اس غلام نے جہاں پناہ کو انصاف کرنے کا ایک

بہت ہی اچھا موقع بہم پہنچا دیا ہے۔

شہنشاہ:۔ غور کرنے کے بعد ما بدولت بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ تاریخ میں اس سے پہلے جہانگیر کو ایسے موقع سے دوچار ہونا پڑا تھا لیکن ہم عہد جدید کے شہنشاہ ہیں۔ جہانگیری عدل فی زمانہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ خون کا بدلہ صرف خون ہے۔

ہیڈ بٹلر:۔ کیا والاشان شہزادیاں خاکم بدہن....

شہنشاہ:۔ وزیر الفاظ۔ ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دو۔

چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے

چوبدار:۔ باادب، باملاحظہ، ہشیار، نظریں روبرو۔ باادب، باملاحظہ ہشیار، نظریں روبرو۔ ملکۂ عالیہ کی سواری آتی ہے

ملکۂ عالیہ کی سواری بال کھولے ہوئے آتی ہے۔

ملکہ:۔ جہاں پناہ۔ یہ میں کیا سُن رہی ہوں۔

شہنشاہ:۔ خون کا بدلہ خون۔ ہماری مملکت کے ہر در و دیوار سے یہی صدا آرہی ہے۔ خون کا بدلہ خون... کوئی خون بہانہ ہوگا....

ملکہ:۔ جہاں پناہ۔

ہیڈ بٹلر:۔ عالم پناہ!!

فریادی :۔ ساڑھے سات سو دھوبیوں کے لواحقین گیتی پناہ، خون کا بدلہ خون نہیں چاہتے..... فی دھوبی پانچ سو روپے کافی ہیں۔

شہنشاہ :۔ نہیں، مابدولت اپنے دامنِ عدل پر جہانگیر کی طرح کوئی دھبہ نہیں لگنے دیں گے.... خون کا بدلہ خون ہے۔ خون بہا نہیں۔ خون کا بدلہ صرف خون ہے ــــ وزیر الفاظ! والا شان شہزادیوں کی تعداد کیا ہے؟

ہیڈ بٹلر :۔ پچھلے برس کے اعداد و شمار کے مطابق والا قدر شہزادیوں کی تعداد ایک سو بیس تک پہنچی تھی جہاں پناہ۔

ملکہ :۔ ان میں میری کوئی دختر شامل نہیں۔ لیکن میں جہاں پناہ سے پھر بھی درخواست کرتی ہوں کہ....

شہنشاہ :۔ ہمیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دو ملکہ ــ خون کا بدلہ خون ہے۔

فریادی :۔ جہاں پناہ ــ اُن ساڑھے سات سو دھوبیوں میں خون کا صرف ایک قطرہ تھا۔

شہنشاہ :۔ تمہیں کیسے معلوم ہے؟

فریادی :۔ سارا خون نچوڑ کر میں نے صرف ایک قطرہ باقی چھوڑ دیا تھا۔ کہ ان میں زندگی کی رمق باقی رہے۔

شہنشاہ :۔ مابدولت کی نگاہِ عدل میں خون کے ایک قطرے اور خون کے ایک سمندر میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے پیشتر کہ رجعت پسند قوتیں ہمیں گمراہ

کرنے پائیں۔ مملکت کے طول و عرض میں ریڈیو اور اخباروں کے ذریعہ سے اعلان کر دیا جائے کہ ہم لانڈری والے کیس کا فیصلہ کرنے میں اپنی مثالی غیر جانب داری سے کام لینے کا تہیہ کر چکے ہیں — خون کا بدلہ خون ہے ۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ والا شان شہزادیوں کی رگوں میں ہمارا نیلا خون دوڑ رہا ہے ۔ لیکن اسے دھوبیوں کے سُرخ خون کا بدلہ دینا ہوگا — ہر چہار اکناف اعلان کر دیا جائے کہ مابدولت نے اس سنگین مقدمے کا فیصلہ مرتب کرنے کے لئے ایک کمیشن بٹھا دیا ہے ۔

ہیڈ بٹلر: کمیشن؟

ملکہ: کمیشن؟؟

فریادی: کمیشن؟؟؟

شہنشاہ: ہاں، کمیشن — یہ کمیشن ملک کے دو سب سے بڑے دو دھوبیوں دو سب سے بڑے ڈرائی کلینروں، اور چھ سب سے بڑے خطاب یافتہ سرکاری منصفوں پر مشتمل ہوگا — ہیڈ بٹلر جس کو ہم نے پہلے سر کا خطاب عنایت کیا تھا اور بعد میں وزیر الفاظ بنا دیا تھا۔ اس کمیشن کا صدر ہوگا ۔

ہیڈ بٹلر: غلام سے اتنا بڑا کام سر انجام نہیں دیا جا سکے گا یور میجسٹی ۔

شہنشاہ: مابدولت کو اس کا علم ہے — تمہاری صدارت میں تحقیقاتی کمیشن

جونہی اپنی رپورٹ مرتب کرے گا۔ عوام کی کامل تسلّی و تشفی کے لئے مابدولت اس کمیشن پر ایک اور کمیشن بٹھائیں گے۔ تاکہ عدل وانصاف کی نگاہ سے کوئی گوشہ، کوئی کونہ پوشیدہ نہ رہے۔

ہیڈ بٹلر:۔ عالم پناہ عوام کی تشفی پھر بھی نہیں ہوگی ــــ انکار ان کی سرشت میں داخل ہے۔

شہنشاہ:۔ (فکرمند ہوکر) عوام کی تشفی بہت ضروری ہے . . . . سب سے مقدم ہے . . . . ہم اُس وقت کوئی فیصلہ مرتب کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جب تک اس معاملے میں ہماری تشفی نہ ہو کہ عوام ہماری طرف سے بالکل تشفی ہیں . . . . ہوالشافی کہہ کر چنانچہ ہم سب سے پہلے، سب سے ضروری کمیشن بٹھاتے ہیں ــــ اس کا نام شافی کمیشن ہوگا۔

ہیڈ بٹلر:۔ عالم پناہ زندہ باد!

ملکہ:۔ عدل وانصاف پائندہ باد!!

فریادی:۔ شافی کمیشن جو ئندہ باد!!!

غالب اور سرکاری ملازمت

حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے کے متصل یہ جو مسجد کے عقب میں ایک مکان ہے مرزا غالب کا ہے۔ اسی کی نسبت آپ نے ایک دفعہ کہا تھا ؎

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

آئیے ہم آپ کو دیوان خانے میں لے چلیں۔ کوئی حرج نہیں، رات ہے تو کیا، مرزا صاحب کے یہاں یقیناً اس وقت بھی رونق ہو گی — رونق تو خیر اتنی نہیں۔ لیکن منشی شونرائن موجود ہیں۔

(مرزا صاحب سے کاغذ لیتے ہوئے)

منشی شونرائن:- تو کیا سچ مچ یہ غزل آپ کی نہیں؟

غالب:۔ (جھنجھلا کر) بھائی حاشا حاشا تم حاشا اگر یہ غزل میری ہو۔ اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں۔ لاحول ولا۔۔ اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں۔ لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔ اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا۔ قبلہ آپ نے کیا خوب کہا ہے ؎

اسد اس جفا پہ بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے اس سے کہا۔ اگر یہ میرا مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں اور یہ غزل انہی کے شاندار کلام کا نمونہ ہے۔۔ منشی شیو نرائن تم طرزِ تحریر پر بھی غور نہیں کرتے۔

منشی شیو نرائن:۔ (کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) مجھے افسوس ہے

(مرزا غالب کا نوکر کلّو داخل ہوتا ہے)

کلّو:۔ حضور منشی غلام رسول صاحب آئے ہیں۔

غالب:۔ تشریف لائیں۔

(کلّو کمرے سے باہر جاتا ہے اور منشی غلام رسول داخل ہوتے ہیں)

غلام رسول:۔ تسلیم بجا لاتا ہوں مرزا صاحب۔

غالب:۔ تسلیم، کہئے کیونکر آنا ہوا منشی صاحب۔

غلام رسول:۔ مسٹر ٹامسن صاحب سیکرٹری بہادر نے آپ کی خدمت میں سلام

عرض کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ جناب کو کالج میں فارسی کا استاد مقرر کریں

منشی شیو نرائن :۔ مبارک ہو مرزا صاحب۔

غالب :۔ بھئی پوری بات تو سُن لو ـــــ ہاں تو اور کیا منشی صاحب؟

غلام رسول :۔ اُنہوں نے کل دس بجے آپ کو بلایا ہے۔

غالب :۔ بہتر، میری طرف سے بہت بہت سلام عرض کیجئے گا اور کہئے گا کہ

زہے نصیب آپ نے مجھے منتخب فرمایا ہے ـــ میرا شکریہ قبول ہو۔

غلام رسول :۔ تو میں سیکرٹری صاحب بہادر کی کوٹھی کے پائیں باغ میں حاضر

رہوں گا اور جونہی آپ تشریف لائیے گا۔ فوراً آپ کی تشریف آوری کی

خبر کر دوں گا۔

غالب :۔ آپ کی نوازش ہے، میں وقت پر حاضر ہو جاؤں گا۔

غلام رسول :۔ اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں۔

(منشی غلام رسول کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں)

منشی شیو نرائن :۔ (مسکراتے ہوئے) اب تو اجازت ہے مبارکباد دینے کی۔

غالب :۔ (مسکرا کر اُٹھتے ہوئے) نہیں ـــ سب سے پہلے مجھے اپنی بیگم کی مبارکباد

لینے دو۔

مرزا غالب زنانخانے میں خوش خوش داخل ہوتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ امراؤ بیگم

بیٹھی وضو کر رہی ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی انہوں نے مُنہ سجا لیا اور لڑنا شروع کیا

امراؤ بیگم :۔ آج دو روز سے کہہ رہی ہوں کہ ایک وقت میرے پاس بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے میری چند باتیں سُن لیجئے۔ پر آپ کو فرصت کہاں۔

غالب :۔ (پاس ہی چوکی پر بیٹھ کر) بیگم صاحبہ! مجھے معلوم ہے کہ آپ نہیں نہیں چٹکیاں لے کر نصیحتیں یا فضیحتیں کیجئے گا۔ خیر فرمایئے۔

امراؤ بیگم :۔ (چڑ کر) دیکھئے پھر آپ نے طعن طرز کی باتیں شروع کر دیں۔

غالب :۔ (زیرِ لب مسکراتے ہوئے) اچھا جو آپ کہنا چاہتی ہیں کہئے۔

امراؤ بیگم :۔ میں کہتی ہوں کہ کب تک گھر کا اساسہ بیچ کر گذران ہوگی۔ کس طرح یہ بیل منڈھے چڑھے گی۔ قرض کس صورت سے ادا ہوگا۔ اے قرض جائے جہنم میں۔ روزمرہ کے مصارف کس طرح پورے ہوں گے۔ اب تو لتے بدن پر جو لتے کا زمانہ آ گیا ہے۔

غالب :۔ (پُراسرار طریقے پر مسکراتے ہوئے) آپ گھبرایئے مت۔ خدا نے سن لی ہے۔ (چوکی پر سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

امراؤ بیگم :۔ کیا سُن لی ہے خُدا نے؟

غالب :۔ (فاتحانہ انداز میں) آپکے وظیفوں کی برکت سے مسٹر ٹامسن بہادر نے مجھے بُلایا ہے۔ کالج میں فارسی زبان کا استاد مقرر کرنا چاہا ہے اور یقینی طور پر میری ہی اک ایسی ذات ہے جو اس عہدے کے لائق ہے۔

امراؤ بیگم :- اپنے منہ میاں مٹھو۔

غالب :- اجی سن تو لیجئے ۔ کم سے کم ۔ کم سے کم ۔ کچھ نہیں تو سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تو میرا مقرر ہو ہی جائے گا ۔ لیجئے اب خوش ہوئیں ۔

امراؤ بیگم :- (لوٹا لے کر اٹھتے ہوئے) ہو گئی ۔

غالب :- تو ذرا ہنس دیجئے ۔

امراؤ بیگم :- چو چلے نہ بگھاریئے ۔

غالب :- (خوش طبعی سے) نہیں میری جان کی قسم ہنسو، تاکہ ذرا مجھے تمہاری طرف سے اطمینان ہو۔

امراؤ بیگم :- (کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے)

غالب :- (اطمینان کے ساتھ) خدا میری بیگم کو ہنستا ہی رکھے۔ بھئی امراؤ بیگم تم غالب کی روح و رواں ہو۔

امراؤ بیگم :- اب اپنی شاعری رہنے دیجئے اور صاحب سکتر بہادر کے ہاں جانے کی تیاری کیجئے۔

دوسرے روز صبح کو مرزا غالب مسٹر ٹامسن سے ملاقات کرنے کے لئے تیار ہونے لگے۔

غالب :- (مضطرب حالت میں) کیوں میاں مداری، کلو داروغہ کہاں گئے؟

مداری :۔ جی ابھی تو یہیں تھے حضور۔ شاید معظم علی عطر فروش کی دکان پر بیٹھے ہوں گے۔

غالب :۔ ذرا بلا لانا۔ مجھے صاحب سکتر بہادر کے ہاں جانا ہے۔ میرے درباری کپڑے نکال دیں۔

مداری :۔ (قدموں کی چاپ سُن کر) لیجئے کلّو داروغہ آگئے۔

(کلّو داخل ہوتا ہے)

کلّو :۔ آپ نے مجھے یاد فرمایا۔

غالب :۔ بھئی کلّو۔ تم کہاں دن بھر غائب رہتے ہو؟

کلّو :۔ کیا حکم ہے سرکار؟

غالب :۔ ذرا میرے درباری کپڑے نکالو۔ مجھے آج دس بجے سیکرٹری صاحب بہادر کے ہاں جانا ہے۔

کلّو :۔ (جا کر پلٹتے ہوئے) کیوں سرکار۔ وہ شالی چوغہ اور دستار تو ضرور نکالی جائیگی۔ جوڑا کون سا نکالا جائے؟

غالب :۔ وہ ٹانڈے کی جامدانی کا انگرکھا یا وہ ریشمی دھاری دار قلمکار اور جو بادامی سلیم شاہی جو آج آٹھ روز ہوئے میں نے خریدا ہے ۔۔ ہاں اور اک شالی رومال بھی نکال لینا۔

دربار ی کپڑے پہن کر مرزا غالب تیار ہوئے اور ہوادار میں سیکرٹری صاحب بہادر

کی کوٹھی پر پہنچے۔ منشی غلام رسول پائیں باغ میں پونے دس بجے سے اُن کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ جُونہی کہاروں نے ہوادار کو کندھوں سے اتارا منشی غلام رسول مسٹر ٹامسن بہادر کو خبر دینے کے لئے کوٹھی کے اندر داخل ہُوئے۔

غلام رسول:۔ سرکار مرزا غالب سلام عرض کرتے ہیں اور فرماتے ہیں حسب الحکم میں حاضر ہوں۔

ٹامسن:۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) بہت پابندیٔ وقت سے تشریف لائے۔ اچھا سلام دو اور کہو تشریف لائیں۔

منشی غلام رسول باہر آئے۔ غالب چہل قدمی کر رہے تھے۔

غلام رسول: حضور تشریف لے چلیئے۔ صاحب بہادر یاد فرماتے ہیں۔

غالب:۔ (حیرت سے) کیا کہا؟

غلام رسول:۔ آپ کو بلایا ہے حضور۔

غالب:۔ بُلایا ہے؟ — دستور کے موافق صاحب سکتر بہادر مجھ ناچیز کو لینے آئیں تو میں چلا چلوں گا۔

غلام رسول:۔ بہتر ہے جا کر عرض کرتا ہوں۔

منشی غلام رسول ایک بار پھر اندر آ گئے اور مسٹر ٹامسن سے کہا۔

غلام رسول:۔ حضور وُہ فرماتے ہیں کہ حسبِ دستور میرے لینے کو آئیں تو میں چلوں

ٹامسن :۔ (مسکرا کر) بڑے بگڑے دل دماغ دار معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔ چلو، میں
خود اُن سے بات کرتا ہوں۔

مسٹر ٹامسن کوٹھی سے باہر نکلے اور مرزا غالب سے مصافحہ کیا۔

ٹامسن: تسلیم عرض کرتا ہوں مرزا صاحب۔

غالب :۔ کورنش بجالاتا ہوں۔

ٹامسن :۔ آپ اندر تشریف کیوں نہیں لائے۔

غالب :۔ دستور کے موافق آپ مجھ ناچیز کو لینے آتے۔ میں حاضر ہوتا۔

ٹامسن :۔ (مسکرا کر) مرزا صاحب۔ جب آپ دربارِ گورنری میں تشریف لائیں گے
تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا، لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے
آئے ہیں۔ اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا ہے۔

غالب :۔ قبلہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ کر کے حاضر ہوا ہوں اور یہ اُمید تھی
کہ اس ملازمت سے کچھ عزت زیادہ ہو جائے۔ نہ اس لئے کہ رہی سہی
عزت میں فرق آئے۔

ٹامسن :۔ میں قاعدے سے مجبور ہوں۔

غالب :۔ (ہوادار کی طرف جاتے ہوئے) تو مجھے اس خدمت سے معاف رکھا
جائے ۔۔۔ تسلیم عرض ہے۔

ٹامسن :۔ تشریف لے جائیے گا ....؟

غالب ہوادار میں بیٹھ جاتے ہیں اور کہاروں کو حکم دیتے ہیں کہ واپس گھر چلو۔ واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں۔ گھر کے باہر اپاہجوں اور بھکاریوں کا ہجوم جمع ہے اور بی رحیمن اُن میں خیرات بانٹ رہی ہے۔ مرزا صاحب کو سخت حیرت ہوئی۔ جلدی جلدی اندر داخل ہوئے۔ صحن میں پہونچے تو دیکھا کہ تخت پر امراؤ بیگم دوگانہ ادا کرنے میں مشغول ہیں۔ انہوں نے سلام پھیرتے ہی مرزا صاحب کو مخاطب کیا۔

امراؤ بیگم:۔ الحمدللہ ۔۔ کیسے خدا کا فضل ہو گیا۔

غالب:۔ (غالب تخت پر بیٹھتے ہوئے) جی ہاں ۔۔ ہو گیا۔

امراؤ بیگم:۔ کیا مطلب؟

غالب:۔ مطلب یہ کہ رہی سہی عزت مٹی میں ملنے سے بچ گئی۔

امراؤ بیگم:۔ ہائیں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔

غالب:۔ (اُٹھ کر تمکنت کے ساتھ) بیگم۔ عزت و ناموس کے لئے ہم مغل بچے مر مٹنے والے ہیں۔ میں وہاں اس خیال سے گیا تھا کہ ملازمت سرکاری سے کچھ اس عزت میں اضافہ ہو جائے گا۔ مگر وہاں صاحب سکتر بہادر میرے استقبال کو باہر نہ آئے ۔۔ بھلا سوچو۔ مجھے یہ بے عزتی کیسے گوارا ہو سکتی ہے ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

لیکن میں پوچھتا ہوں۔ یہ باہر خیرات کیسی بٹ رہی ہے۔

امراؤ بیگم :۔ (فکرمند ہو کر) کچھ نہیں۔

غالب :۔ کچھ نہیں کیا — تم تو ابھی کل ہی کہہ رہی تھیں، کب تک گھر کا اساسہ بیچ کر گزران ہوگی۔

امراؤ بیگم :۔ (مسکرا دیتی ہیں)

غالب :۔ ارے بھئی کچھ بتاؤ۔ تو؟

امراؤ بیگم :۔ کیا بتاؤں؟ — کل میں نے اپنا جڑاؤ گلوبند بی رحمین سے گرو رکھوا کر کچھ روپے منگوائے تھے — شہر میں آپ کی ملازمت کا چرچا سُنکر در پر یہ بھکاری جمع ہو گئے تو میں نے بی رحمین سے کہا "جاؤ اُن کا سر صدقہ دے آؤ۔"

غالب کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ امراؤ بیگم گہرے سوچ میں پڑ جاتی ہیں۔

آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی

کشمیرن والے کٹڑے میں ایک چھت پر مرزا اسد اللہ خاں (غالب) اور اُس سے کچھ دُور دوسری چھت پر کنور بلوان سنگھ پتنگ بازی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اسد اللہ خاں ہوا کا رُخ دیکھتا ہے اور اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف سے کہتا ہے "یوسف ذرا وہ لال حمید ہر بڑھانا — اس مانگ پاٹی پتنگ کی چلت پھرت اچھی رہے گی۔ مرزا چھیلا کے ہاتھ کے کانپ ٹھڈے چھلے ہوئے ہیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے پتنگ کو ماہرانہ انداز سے دیکھا۔ "بڑا ہی زور دار پتنگ ہے" اور بنسی دھر سے مخاطب ہو کے کہا۔ "وہ دو دیلی نخ والی چرخی جو چھوٹی تپائی پر دھری ہے لے لو۔ اور اُس پر یہ پتنگ بڑھاؤ۔"

بنسی دھر نے پتنگ لیا اور مرزا یوسف نے چرخی اٹھا کر کہا۔ "لیکن بھائی جان اس نخ کا مانجھا تو بہت کھردرا ہے۔" اور ڈور پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "یہ تو ڈھیل پر اڑانے

کی نحن ہے۔"

اسد اللہ نے ذرا ہنستا کر کہا۔" بھئی بلوان سنگھ زیادہ ڈھیل ہی کے پیچ لڑاتے ہیں۔ یہ کھینچ کے پیچ سے وہ بھاگتے ہیں۔ میں نے خود اسی خیال سے مانجھا کھرا رکھوایا ہے"

مرزا یوسف بڑے بھائی کی بات سُن کر خاموش ہو گیا۔

ادھر دوسرے کوٹھے پر کنور بلوان سنگھ سے اُس کا دوست شمشیر سنگھ کہہ رہا تھا۔" کنّے میں باندھ لوں یا آپ باندھ دیجئے گا۔"

بلوان سنگھ نے آسمان میں اڑتے ہُوئے پتنگوں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔"تمہیں باندھ لو۔ لیکن دیکھو دوہرے کنّے ہوں۔" پھر شمشیر سنگھ کی طرف دیکھ کر تاکیداً کہا۔" اور سُنا تم نے۔ اوپر سات اور نیچے پانچ گرہیں لگانا۔ ہوا ذرا تیز ہے اور پتنگ بھی زوردار ہے۔"

شمشیر نے ایسا ہی کیا اور پتنگ بڑھا کر کنور بلوان سنگھ سے کہا۔" بلوان سنگھ میں تو کھینچ کے پیچ لڑاؤں گا۔ تو سہی۔ اس دو بانہ سے مرزا نوشہ کی پتنگ بُلوا دُوں۔"

کنور مسکرایا اور اپنی نامعلوم مونچھوں کو تاؤ دے کر اسد اللہ خاں کی طرف دیکھا۔ جو اپنا پتنگ بڑھانے میں مشغول تھا اور چلّا کر کہا۔" کیوں مرزا نوشہ۔ اس مانگ پاٹی پتنگ سے تو مرزا چھیلا کے ہاتھ کی ساخت ٹپک رہی ہے اور سجاوٹ بھی انہی کے ہاتھ کی ہے۔ خوب اڑاڑے لے رہا ہے۔"

ادھر سے اسد اللہ نے کہا۔" تو اور کیا؟"

اُدھر سے کنور بلوان سنگھ چلّایا۔" مگر بھئی سُنا مرزا نوشہ۔ میں کھینچ گھسیٹ کے

پیچ نہیں لڑاؤں گا۔ تم ٹھہرے سپاہی۔ مار دھاڑ کی سوجھتی ہے۔ میں تو ڈھیل کے پیچ لڑاؤں گا۔ کم از کم پیلٹی دو۔ پیٹی رُخ پر ہو تو وہاں ملانے کا مزا آتا ہے۔"

اسد اللہ نے پتنگ کو خوب ڈور پلائی اور بلوان سنگھ کو جواب دیا۔" کنور صاحب آپ دو نہیں، تین پیٹی پر پتنگ ملائیے۔ آج اس پتنگ سے نو پیچ کاٹوں گا۔ نوشیرواں بنا کے چھوڑوں گا۔"

یہ سُن کے بنسی دھر ذرا آگے بڑھا اور بلند آواز سے کہا۔" کنور صاحب سُنتے ہیں۔ نو پیچ تو مرزا نوشہ آپ کے سر چڑھائیں گے اور دسواں گیارھواں میرے آپ کے پیچ لڑے گا۔ میں اس دوباز سے آپ کا پٹیا کاٹوں گا اور ایک کے کنّے توں گا۔"

بلوان سنگھ ہنسا۔" لالہ تمہارے تو پھیا رنڈی کنّے لے گی۔ تم مجھ سے کیا پیچ لڑا سکتے ہو۔ اچھا رہی۔ تم سے بھی آخر کے دو پیچ لڑیں گے۔"

شمشیر سنگھ چلّایا۔" بنسی دھر تمہارے دوباز کو تو بڑھاتے ہی ہاتھ پر کاٹوں گا۔ تو سہی۔ قلابازی کھاتا ہوا قلعے تک جائے۔ وہاں کے تلنگے تمہارا دوباز لوٹیں اور تمہارا گُن گائیں۔"

اس پر دونوں دوستوں نے خوب قہقہے لگائے۔ ادھر اسد اللہ خاں نے جس کی آنکھیں اپنے دوباز پر جمی تھیں بنسی دھر سے جو پتنگ بڑھا رہا تھا۔ کہا "بنسی دھر ہوا کا رُخ بُرا معلوم ہوتا ہے۔ پتنگ ایک ہی پیلٹی پر بنڈول جانے لگا۔ اچھا ملاؤ۔"

تھوڑی دیر کے بعد پیچ مل جاتے ہیں۔ لیکن بلوان سنگھ نے ذرا اپنا پتنگ روک کر ایک ایسا آڑا ہاتھ مارا کہ اسداللہ خاں کٹ جاتا ہے۔ اس پر بلوان سنگھ اور اُس کے ساتھی ایک شور برپا کر دیتے ہیں۔ "وہ کاٹا — وہ کاٹا — مرزا نوشہ کٹ گئے۔"

اسداللہ خاں بگڑ جاتا ہے اور سارا زلزلہ یوسف اور بنسی دھر پر گرتا ہے "بنسی دھر تمہاری جو بات ہے، بے عقلی سے خالی نہیں۔ گدھے — نہیں گدھوں کے سردار ہو تم نے بہت ہی کھُردرا مانجھا رکھوایا۔ ورنہ یہ پیچ کٹنے والا نہ تھا۔" پھر مرزا یوسف پر بگڑنا شروع کیا۔ "یوسف تم نے بھی مجھ پر زور نہ دیا کہ بھائی جان اس رُخ پر پتنگ نہ بڑھائیے۔"

مرزا یوسف نے آہستہ سے جواب دیا۔ "بھائی جان میں نے تو عرض کیا تھا کہ مانجھا بہت کھُردرا ہے اور اس پر ڈھیل ہی کے پیچ لڑیں گے۔ اصل میں بلوان سنگھ نے دھوکا دیا۔ پہلے کہا، پیچ بیٹھی دو بیٹھی پر لڑیں گے اور کھینچ کر پتنگ کاٹ لیا۔"

بنسی دھر نے چرخی تپائی پر رکھی اور کہا۔ "چھوٹے مرزا سچ کہہ رہے ہیں۔" مگر اسداللہ جسے شکست نے جھنجھلا دیا تھا اور بھی بگڑ گیا۔ "تم دونوں پتنگ بازی سے ناواقف ہی فقط نہیں۔ بلکہ نرے کھرے بیوقوف ہو۔ اُلو کی دُم فاختہ۔"

بنسی دھر نے غصّہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی "خیر اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ آپ نے سینکڑوں پیچ کاٹے ہیں۔ آج بلوان سنگھ نے دھاندلی کر کے ایک پیچ کاٹ لیا تو کیا ہوا۔"

بہت دیر کے بعد مرزا اسداللہ خاں کا غصّہ ٹھنڈا ہوا اور آخر میں یہ طے ہوا

کر چوسر کی ایک بازی رہے۔ چنانچہ تینوں کوٹھے سے اُترے اور گھر کا رُخ کیا۔

مرزا اسداللہ خاں کے نانا خواجہ غلام حسین خاں زنانخانے سے باہر نکل رہے تھے کہ چلمن اُٹھی اور امراؤ بیگم کی آواز آئی: "نانا جان، آپ سے ایک بات کہنی تو بھول ہی گئی۔"

خواجہ غلام حسین نے اپنے قدم روک لئے اور پوچھا "کیوں امراؤ بیگم خیر تو ہے"

امراؤ بیگم نے دروازے کی آڑ میں شرماتے ہوئے کہا، "نانا جان آپ اُن کو منع بھی نہیں کرتے"۔

"کسے بیٹا؟"

امراؤ بیگم اور زیادہ شرما گئی: "اُن ہی کو"۔

خواجہ صاحب سمجھ گئے: "بس سمجھا۔ مرزا نوشہ کو"۔

"جی ہاں آپ اُن کو منع ہی نہیں کرتے۔ دن بھر چوسر کھیلتے رہتے ہیں اور۔۔

۔۔۔ اور شام کو روزانہ کنور بلوان سنگھ سے پتنگ بازی ہوتی ہے"۔

خواجہ صاحب نے سرد آہ بھری: "میں جانتا ہوں"۔

امراؤ بیگم نے دکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا: "پیسہ اُڑ رہا ہے اور اُن کے مزاج سے تو آپ واقف ہی ہیں — میری مجال ہے جو میں اشارے کنائے میں بھی اس بات کو اُن پر جتاؤں"۔

خواجہ صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "ہاں بیٹی! میں بھی کئی دن سے

سوچ رہا تھا کہ اُس کو مناسب طور سے سمجھاؤں۔ سو آج تم نے مجھے یاد دلا دیا۔ میں ضرور کہوں گا۔ تم خاطر جمع رکھو۔"

امراؤ بیگم کو کچھ تسلّی ہوئی "حضور آپ ہی خیال کریں کہ اس طرح قارون کا خزانہ بھی ہو تو خالی ہو جائے ــــ ذرا نہیں سمجھتے کہ آج ..." شرماجاتی ہے "ہم دو ہیں۔ کل تین ہو جائیں۔ اپنے فضل و کرم سے کوئی نیا بندہ اللہ بھیج دے تو اُس کی پرورش تعلیم سبھی تو ہے۔"

خواجہ صاحب مسکرائے "خدا تیری زبان مبارک کرے۔"

"جب ہی تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ اُن کو نصیحت کیجیے ــــ اگر سنیں گے تو وہ آپ ہی کی سنیں گے ــــ مجھے تو وہ خطے ہی میں نہیں لاتے۔"

خواجہ صاحب نے ڈیوڑھی کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا "اچھا بیٹی، لو میں آج ہی کہتا ہوں۔"

خواجہ صاحب جونہی ڈیوڑھی میں پہنچے۔ اُن کی اسد اللہ۔ بنسی دھر اور مرزا یوسف سے مڈبھیڑ ہو گئی جو کشمیرن والے کرٹے سے آرہے تھے۔ خواجہ صاحب نے اسد اللہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "صاحب زادے۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا ادھر آؤ۔" پھر یوسف اور بنسی دھر سے کہا "آپ دیوانخانے میں چل کر بیٹھے۔ یہ تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔"

بنسی دھر اور مرزا یوسف چلے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب وہیں ڈیوڑھی میں

اسد اللہ خاں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ مرزا نوشہ میرے اس سوال کا جواب دو۔ مجھے اپنا بہی خواہ سمجھتے ہو یا دشمن بدخواہ؟"

اسد اللہ سٹپٹا گیا۔ "نانا جان۔ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ نے مجھے پالا ہے پرورش کیا ہے۔ آپ میرے بہی خواہ کیا معنی ولی نعمت ہیں"۔

خواجہ صاحب اور زیادہ سنجیدہ ہو گئے "مرزا نوشہ۔ اب تمہاری عمر ماشا اللہ سولہ سترہ کے لگ بھگ ہے۔ لیکن تمہارا شغل اب سوائے دن بھر چوسر کھیلنے اور شام کو پتنگ اڑانے کے اور کچھ نہیں رہا۔ دولت برباد کر رہے ہو بھائی! ہوش میں آؤ۔ کوئی کمال حاصل کرو۔ نام و نمود پیدا کرو۔ اپنے بڑوں کی جائداد میں اضافہ کرو"۔

خواجہ صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامنے سے مرزا اسد اللہ کے اُستاد مولوی عبدالصمد پارسی۔ ایرانی آتے دکھائی دیئے۔ مرزا اسد اللہ بڑھ کر کورنش بجالایا۔ "سلام علیکم"

ملّا عبدالصمد صاحب نے شفقت کے ساتھ جواب دیا۔ "زندہ باش"۔

خواجہ صاحب نے اُن سے مصافحہ کیا۔ "میں بھی تسلیم عرض کرتا ہوں"۔

ملّا عبدالصمد صاحب مرزا اسد اللہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور خواجہ صاحب سے کہا۔ "مزاج مبارک"۔

خواجہ صاحب بھی مسکرائے۔ "الحمدللہ۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ آپ

خوب وقت پر آئے۔ میں آپ کے شاگرد کو کچھ نصیحت کر رہا تھا۔"

ملا صاحب ایک بار پھر اسداللہ کی طرف دیکھ کے مسکرائے۔ خواجہ صاحب نے کہنا شروع کیا "میں اس سے کہہ رہا تھا کہ بھئی۔ اب تم سولہ سترہ برس کے ہو گئے ہو۔ ایک بچے کے باپ ہونے والے ہو۔ ذرا لہو و لعب، کھیل کود سے ہاتھ اٹھاؤ۔ کچھ دنیا میں نام پیدا کرو۔ کوئی کمال حاصل کرو۔"

ملا عبدالصمد صاحب نے جنہیں غالباً اسداللہ خاں نے کوئی اشارہ کیا تھا اُس سے کہا "جاؤ بابا جاؤ۔ میں خواجہ صاحب سے باتیں کر کے ابھی تمہارے پاس آتا ہوں۔"

اسداللہ خاں نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے بعد ملا صاحب خواجہ غلام حسین خاں سے مخاطب ہوئے "جناب خواجہ صاحب بُرا نہ مانیئے تو ایک بات عرض کروں۔"

خواجہ صاحب نے فوراً ہی کہا "نہیں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ آپ فرمایئے کیا ارشاد ہے؟"

ملا صاحب کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پیدا ہوئی "مرزا نوشہ۔ آپ کی طرح کمیدان یا باپ دادا کی طرح رسالدار یا اُن سے بھی زیادہ عہدہ ہفت ہزاری پر پہنچ کر سپہ سالار بھی ہو گیا تو کیا۔ ایسوں کے نام اُن کے ساتھ ہی مٹ جاتے ہیں مگر اسے تو ادب اور شعر کا افراسیاب بننا ہے۔"

خواجہ غلام حسین کچھ چکرا سے گئے "آپ کی اس تقریر سے میں کچھ نہ سمجھا آپ کا مطلب کیا ہے؟"

ملا صاحب نے اپنا مطلب واضح کیا "اسد اللہ خاں بہت بڑا شاعر ہوگا۔ اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ کا اور ہمارا نام اسی کی بدولت روشن ہوگا۔ سو اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

خواجہ صاحب نے ملا عبدالصمد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "ملا صاحب میں تو جیاب بر آب ہوں اور آپ اپنے وطن ایران جا رہے ہیں۔ باقی اگر آپ کا یہی خیال ہے کہ مرزا نوشہ فنِ شاعری میں نام پیدا کرے گا اور اس کا کلام قیامت تک باقی رہے گا تو یونہی سہی ــــ خدا ایسا ہی کرے۔ آپ کے منہ میں گھی اور شکر"

دونوں باتیں کرتے ہوئے دیوان خانے میں چلے گئے۔ اُدھر بنسی دھر کے مکان میں چوسر بچھی ہوئی ہے اور اسد اللہ خاں بُری طرح اس کھیل میں محو ہے بنسی دھر نے پانسہ پھینکا اور اسد اللہ خاں سے کہا "رنگ تو آپ سب لے گئے۔ بد رنگ میں یہ دو گوٹیں آپ کی باقی ہیں۔ ان کے لئے ساری اپنی گوٹیں لے کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ اور آپ کو منزلِ مقصود تک نہ پہنچنے دوں گا"

اسد اللہ خاں مسکرایا "یہ گوٹ تو پا، دو بارہ یا سات چھ تیرہ سے اس گھر میں پہنچتی ہے۔ رہی دوسری تو وہ کچے بارہ سے گھر میں جاتی ہے۔ لو دیکھو پھینکتا ہوں"

بنسی دھر نے متنبہ کیا "یا اللہ نہ بنا کر پھینکے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ اُوپر تلے پانسے رکھ رہے ہیں۔"

اسد اللہ خاں نے ہاتھ روک لیا اور بنسی دھر سے کہا "اب رو تے ہو۔" پھر پانسہ پھینکا "یہ پاؤ بارہ۔ وہ مارا۔ پاؤ بارہ۔ لو کچے بارہ بھی لو۔ لو یہ کچے بارہ دیکھ لو کچے بارہ دھرے پڑے ہیں۔ یوں پانسہ پھینکتے ہیں۔"

مرزا یوسف نے جو بغل میں بیٹھا تھا کہا "بھائی جان، آپ کی پشت پر جوگنی ہے جوگنی۔"

اسد اللہ خاں نے ذرا اُوں کی لی "کہو بنسی دھر چھ تین نو پھینکوں؟"

بنسی دھر مسکرایا "چھ تین نو کہیں آئے نہ ہوں۔"

اسد اللہ خاں نے بڑی پھرتی سے پانسہ پھینکا۔ پر چھ تین نو نہ آئے۔ ابھی پانسے پر بازی رُکی پڑی تھی کہ اتنے میں خواجہ غلام حسین صاحب کا ملازم گھبرایا ہوا گھر میں داخل ہوا اور اطلاع دی "حضور! آپ کے نانا جان کی بُری حالت ہے۔ دل پکڑے کراہ رہے ہیں۔"

اسد اللہ سخت متحیر ہوا۔ "ارے بھئی ابھی ابھی تو میں ان کو ملا صاحب کے ساتھ اچھا بھلا چھوڑ کے آیا ہوں۔" بازی کا خیال آیا تو زچ بچ ہو کر کہا "اور یہاں بازی چھ تین نو پر رُکی ہوئی ہے۔"

اسد اللہ خاں اُٹھنے لگا تو بنسی دھر نے کہا "مرزا نوشہ، اب دو ہاتھ میں

میری ساری گوٹیں پونگ جاتی ہیں۔ یا چھ تین نو پھینکتے جائیے یا ہار مان لیجئے"

اسد اللہ خاں نے جواب دیا "بھئی نانا جان کو دیکھ آؤں۔ تم یونہی بازی بچھی رہنے دو"۔ اور ملازم کے ساتھ چلا گیا۔ گھر پہنچا تو ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ خواجہ غلام حسین بعارضہ دل انتقال کر چکے تھے۔

اپنے نانا کے انتقال کے بعد اسد اللہ خاں کی لاابالی طبیعت اور زیادہ رنگ لائی۔ امراؤ بیگم کی شکایتیں بڑھتی گئیں۔ آخر نواب احمد بخش اپنے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خان معروف کے یہاں گئے اور کہا "نواب احمد بخش مرزا نوشہ نے اپنے نانا کے مرتے ہی خوب گلچھرے اڑانے شروع کیے ہیں۔ میرے خیال میں اگر اُن کا یہی عالم رہا تو جائداد وغیرہ سب گنا لے لگ جائے گی۔ بھتیجی اور بیٹی میں کیا فرق ہے۔ جیسے امراؤ بیگم تمہاری بیٹی ویسی میری۔"

نواب الٰہی بخش نے باادب پوچھا "تو پھر بھائی جان کیا کیا جائے"۔

نواب احمد بخش نے رائے دی "یہ کیا جائے کہ تم مرزا نوشہ کو اپنے پاس بلاؤ اور اپنی نگرانی میں رکھو" اور پھر تاکیداً کہا "دیر نہ کرو۔ جلد جاؤ اور اس کو اپنے آؤ کہ ابھی میں خیریت ہے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ جو اُس کو اور مرزا یوسف کو ملتا ہے وہ بھی چٹ کر جاتا ہے اور میں سُنتا ہوں۔ ماں سے الگ لیتا ہے اور نانا کی جائداد املاک پر بھی ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ یا کر چکا ہے۔ تم اُس سے کہہ دینا کہ بھائی جان نواب احمد بخش صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ تم دلّی چلے آؤ۔"

دونوں بھائیوں کے فیصلے کے مطابق مرزا اسداللہ خاں کو آخر آگرہ چھوڑ کر دلّی جانا پڑا جہاں اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی نگرانی میں اُس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔

غالب اور چودھویں

مرزا غالب اپنے دوست حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "مغل بچے بھی عجیب ہوتے ہیں کہ جس سے عشق کرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی جوانی میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کیا ہے اور اسے مار رکھا ہے۔"

سنہ ۱۲۶۴ھ میں مرزا غالب چوسر کی بدولت قید ہوئے۔ اس واقعے کے متعلق ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں۔ "کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔"

افسانہ نگار کے لئے یہ چند اشارے مرزا غالب کی رومانی زندگی کا نقشہ تیار کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ رومان کی ازلی تکون "ستم پیشہ ڈومنی" اور

کوتوال دشمن تھا" کے مختصر الفاظ ہی مکمل کر دیتے ہیں۔

ستم پیشہ ڈومنی سے مرزا غالب کی ملاقات کیسے ہوئی۔ آیئے ہم تخیل کی مدد سے اس کی تصویر بناتے ہیں۔

صبح کا وقت ہے۔ مرغ اذانیں دے رہے ہیں۔ مرزا نوشہ ہوادار میں بیٹھا ہے۔ جسے چار کہار لئے جا رہے ہیں۔ مرزا نوشہ کی نشست سے پتہ چلتا ہے کہ سخت افسردہ ہے۔ افسردگی کا باعث یہ ہے کہ اُس نے مشاعرے میں اپنی بہترین غزل سنائی۔ مگر حاضرین نے داد نہ دی۔ ایک فقط نواب شیفتہ نے اُس کے کلام کو سراہا۔ صدرالدین آزردہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن بھرے ہوئے مشاعرے میں دو آدمیوں کی داد سے کیا ہوتا ہے۔ مرزا نوشہ کی طبیعت اور بھی زیادہ مکدر ہو گئی تھی۔ جب لوگوں نے ذوق کے کلام کو صرف اس لئے پسند کیا۔ کیونکہ وُہ استادِ شاہ تھا۔

مشاعرہ جاری تھا مگر مرزا نوشہ اُٹھ کر چلا آیا۔ وُہ اور زیادہ کوفت نہیں اُٹھا سکتا تھا۔

مشاعرے سے باہر نکل کر وہ ہوادار میں بیٹھا۔ کہاروں نے پوچھا۔" حضور، کیا گھر چلیں گے"؟

مرزا نوشہ نے کہا۔" نہیں — ہم ابھی کچھ دیر سیر کریں گے۔ ... ایسے بازاروں

سے سے چلو۔ جو سنسان پڑے ہوں۔"

کمار بہت دیر تک مرزا نوشہ کو اُٹھائے پھرتے رہے۔ جس بازار سے بھی گذرے وہ سنسان تھا۔ چودھویں کا چاند غروب ہونے کے لئے نیچے جُھک گیا تھا۔ اُس کی روشنی اُداس ہو گئی تھی۔

ایک بہت ہی سنسان بازار سے ہوادار گذر رہا تھا کہ دور سے سارنگی کی آواز آئی۔ بھیرویں کے سُر تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی عورت کے گانے کی تھکی ہُوئی آواز آئی۔ مرزا نوشہ چونک پڑا۔ اُسی کی غزل کا ایک مطلع بھیرویں کے سروں پر تیر رہا تھا

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

آواز میں درد تھا جوانی تھی۔ لیکن یہ مطلع ختم ہوتے ہی آواز ڈوب گئی۔

دور ایک کوٹھے پر ملکہ جان جمائیاں لے رہی ہے۔ چاندنی بچھی ہُوئی ہے۔ اُس کی سلوٹوں سے اور موتیئے اور گلاب کی بکھری اور مسلی ہوئی پتیوں سے پتہ چلتا ہے کہ محفلِ رقص و سرود کو ٹھنڈے ہُوئے ایک عرصہ گذر چکا ہے۔

ملکہ جان نے ایک لمبی جمائی لی اور اپنا ضعیف بدن جھٹک کر اپنی سانولی سلونی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی نوچی سے جو گاؤ تکئے پر سر رکھے اپنی مخروطی اُنگلیاں چٹخا رہی تھی کہا۔ "مومن ہے، شیفتہ ہے، آزردہ ہے — اُستادِ شاہ ذوق ہے — سمجھ میں نہیں آتا کل کے اس مبتدی شاعر غالب کے کلام میں کیا دھرا ہے۔ کہ

جب نہ تب تو اُسی کی غزل گائے گی۔"

نوچی مسکرائی۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ ایک سرد آہ بھر کر اُس نے کہا۔

"دیکھنا تقریر کی لذّت کو جو اُس نے کہا۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔"

ملکہ جان نے پہلے سے بھی زیادہ لمبی جمائی لی اور کہا "بھئی اب سو بھی چکو۔ بہت راہ دیکھی جمعدار حشمت خاں کی۔"

شوخ چشم نوچی نے اُنگلیوں میں اُنگلیاں ڈال کر بازو اُوپر لے جا کر ایک جمائی لیتے ہوئے کہا "بس اب آتے ہی ہوں گے۔ میں نے تو اُن سے کہا تھا کہ مرزا غالب کے آگے سے جونہی شمع ہٹے وہ اُن کی غزل کی نقل لے کر چلے آئیں۔"

ملکہ جان نے بُرا سا منہ بنایا "اس نگوڑے مرزا غالب کے لئے اب تو اپنی نیندیں بھی حرام کرے گی تو۔"

نوچی مسکرائی۔ سامنے قدّن میاں سارنگی پر ٹھوڑی ٹکائے پینک میں اُونگھ رہا تھا نوچی نے طنبورہ اُٹھایا اور اُس کے تار ہولے ہولے چھیڑنا شروع کئے۔ پھر اُس کے حلق سے خود بخود اشعار راگ بن کر نکلنے لگے۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

قدّن میاں ایک دم چونکا۔ آنکھیں مُندی رہیں لیکن سارنگی کے تاروں پر اُس کا گز

چلنے لگا ۔

میں بلاتا تو ہوں اُن کو مگر اے جذبۂ دل
اُن پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

گانے والی کی تسکین نہ ہوئی۔ چنانچہ اُس نے شعر کو یوں گانا شروع کیا ۔

میں بلاتی تو ہوں اُن کو مگر اے جذبۂ دل
اُن پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

ملکہ جان ایک دم چونکی۔ اُس نے نوچی کو اشارہ کیا۔ وہ بھی چونک پڑی۔ سامنے دہلیز میں مرزا نوشہ ایستادہ تھا۔ ملکہ جان فوراً اُٹھی اور تسلیمات بجا لائی۔ نوچی نے بھی اٹھ کر کھڑے قد تعظیم دی یہ جان کر کہ شہر کے کوئی رئیس ہیں۔ ملکہ استقبال کے لئے آگے بڑھی۔ "آئیے آئیے! تشریف لائیے۔ زہے قسمت کہ آپ جیسے رئیس مجھ غریب کو سرافراز فرمائیں۔ آپ کے آنے سے میرا گھر روشن ہو گیا۔"

مرزا نوشہ نے حُسنِ ملیح کے نادر نمونے کی طرف دیکھا۔ نوچی نے جھک کر کہا "آئیے ادھر مسند پر تشریف رکھئے۔"

مرزا نوشہ ذرا تامّل کے بعد بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ تمہارا گلا بہت سُریلا ہے اور تمہاری آواز میں درد ہے ۔ نہ جانے کیوں بے کھٹکے اندر چلا آیا۔ کیا تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟

نوچی نے پاس ہی بیٹھتے ہوئے کہا: "جی مجھے چودھویں کہتے ہیں۔"

مرزا نوشہ مسکرایا۔ "یعنی آج کی رات"۔

چودھویں مسکرا دی۔ مرزا نوشہ نے کہا۔ "بھئی خوب گاتی ہو"۔

چودھویں نے حسبِ دستور جواب دیا۔ "آپ مجھے بنا رہے ہیں"۔

مرزا نوشہ کو جگت سوجھی۔ "بنائی ترکاری سبزی جاتی ہے۔ تم کو تھوڑے ہی بنایا جا سکتا ہے"۔

چودھویں کو کچھ جواب دینا ہی تھا۔ چنانچہ اُس نے کہا۔ "خوب، خوب، یہ بھی خوب، میں بنی بنائی ہوں، اللہ نے مجھے بنایا ہے"۔

مرزا نوشہ نے مزید جگت کی۔ "اللہ نے سبھی کو بنایا ہے۔ پر تم بنی ابھی نہیں بنی ہو"

چودھویں کے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے چمکیلے دانت موتیوں کی طرح چمکے۔ مرزا نوشہ نے فرمائش کی۔ "جگت کو چھوڑو اور ذرا پھر وہی غزل گاؤ نہ معلوم کس کی غزل ہے۔ "نکتہ چیں ہے غمِ دل ...." ہاں ذرا شروع کرو"۔

چودھویں کو فرمائش کا انداز کچھ پسند نہ آیا۔ چنانچہ اُس نے ذرا تنک کر کہا۔ "یہ غزل غالب کی ہے اور غالب کا سمجھنا کوئی سہل نہیں"۔

مرزا نوشہ نے پوچھا۔ "کیوں؟"

"بھئی کوئی پختہ کار سمجھے۔ آپ ایسے نوجوان کیا سمجھیں گے"۔

مرزا نوشہ مسکرایا۔ "بھاؤ بتا کے گاؤ تو کچھ بھاؤ کے انگوں سے شاید سمجھ لوں"۔

اب چودھویں کو جگت سوجھی۔ ہلکی سی ناک چڑھا کر کہا۔ "بھاؤ کا بھاؤ مہنگا پڑ جائیگا"۔

مرزا نوشہ ایک لحظہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر چودھویں سے مخاطب ہُوا :

"آپ کو غالب کا کلام بہت پسند ہے ؟"

چودھویں نے مختصر جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

ملکہ جان جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی، مرزا نوشہ سے مخاطب ہُوئی۔ "حضور کئی بار کہہ چکی ہوں اس سے کہ ذوق ہے، مومن ہے، نصیر ہے، شیفتہ ہے، سب مانے ہوئے استاد ہیں، پر اسے نہ جانے اس عطائی غالب کے کلام میں کیا خاص بات نظر آتی ہے کہ آپ مومن کی فرمائش کریں گے اور یہ غالب شروع کر دے گی۔"

مرزا نوشہ نے مسکرا کر چودھویں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ایسی کوئی خاص بات ہو گی۔"

چودھویں سنجیدہ ہو گئی۔ "یہ تو وہی سمجھے جس کو لگی ہو۔"

مرزا نوشہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پُوچھا۔ "کیا میں سُن سکتا ہوں۔ وُہ آپ کے دل کی لگی کیا ہے ؟"

چودھویں نے سرد آہ بھری۔ "نہ پوچھئے — کہاں میں ایک غریب ڈومنی کہاں غالب — جانے دیجئے اس بات کو۔ کہئے آپ کس کی غزل سنیں گے ؟"

مرزا نوشہ مسکرایا۔ "غالب کی اور کہئے تو میں آپ کو غالب کے پاس لے چلوں۔ چودھویں کے چاند کا برج اسد میں طلوع ہو جائے۔"

چودھویں اس کا مطلب نہ سمجھی۔ "مجھ ایسی کو وُہ کیا پوچھیں گے — خاک ہو جائیں گے ہم اُن کو خبر ہونے تک۔"

مشاعرے میں مرزا نوشہ کو جو کوفت ہوئی تھی۔ اب بالکل دور ہو چکی تھی۔ ان کے سامنے سانولے سلونے رنگ کی موٹی موٹی آنکھوں والی لڑکی بیٹھی تھی جس کو اس کے کلام سے والہانہ

محبت تھی۔ یہ کیوں اور کیسے پیدا ہوئی۔ مرزا نوشہ بہت دیر تک گفتگو کرنے کے باوجود بھی نہ جان سکا۔ آخر میں مرزا نوشہ نے اس سے پوچھا "کیا تم نے کبھی غالب کو دیکھا ہے؟"

چودھویں نے مختصر جواب دیا۔ "نہیں"۔

مرزا نوشہ نے کہا "میں انہیں جانتا ہوں۔ بہت ہی بگڑے رئیس ہیں۔ تم چاہو تو میں انہیں لا سکتا ہوں یہاں۔"

چودھویں کا چہرہ تمتما اٹھا "سچ؟"

مرزا نے کہا "میں کوشش کروں گا" اور پھر جیب سے ایک کاغذ نکالا "میرا کلام سنو گی؟"

چودھویں نے رسمی طور پر کہا۔ "سنائیے۔ ارشاد"

مرزا نوشہ نے مسکرا کر کاغذ کھولا "یوں تو میں بھی شعر کہتا ہوں۔ پر تمہیں تو غالب کے کلام سے محبت ہے۔ میرا کلام تمہیں کیا پسند آئے گا۔"

چودھویں نے پھر رسمی طور پر کہا۔ "جی نہیں! کیوں پسند نہ آئے گا۔ آپ ارشاد فرمائیے"

مرزا نوشہ نے ابھی اس غزل کے دو ہی شعر سنائے ہوں گے جو اس نے مشاعرے میں پڑھی تھی کہ چودھویں نے ٹوک کر پوچھا "آپ اس مشاعرے میں شریک تھے جو مفتی صدرالدین آزردہ کے یہاں ہوا تھا؟"

مرزا نوشہ نے جواب دیا "جی ہاں"۔

چودھویں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "غالب تھے؟"

مرزا نوشہ نے جواب دیا "جی ہاں"۔

چودھویں نے اور زیادہ اشتیاق سے کہا "کوئی ان کی غزل کا شعر یاد ہو تو سنائیے"

مرزا نوشہ نے افسوس ظاہر کیا اور کہا۔ "اس وقت کوئی یاد نہیں آرہا۔"

اس نے اب خاق کو زیادہ طول نہ دینا چاہا۔ ایک گلوری چودھویں کے ہاتھ کی بنی ہوئی لی ۔ خاصدان میں ایک اشرفی رکھی اور رخصت چاہی۔

کوٹھے سے نیچے اترا تو سیڑھیوں کے پاس مرزا نوشہ کی مڈبھیڑ جمعدار حشمت خان سے ہوئی جو مشاعرے سے واپس آرہا تھا۔ حشمت خاں اس کو دیکھ کر ہچکچا رہ گیا۔ "مرزا نوشہ آپ یہاں کہاں؟"

مرزا نوشہ خاموش رہا۔ حشمت خاں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "تو یہ کہئے کہ آپ کا بھی اس وادی میں کبھی کبھی گذر ہوتا ہے؟"

مرزا نوشہ نے مختصر سا جواب دیا۔ "فقط آج ۔ اور وہ بھی اتفاق سے ۔ خدا حافظ"

یہ کہہ کر وہ ہوادار میں جیٹھ گیا۔ حشمت خان اوپر گیا تو چودھویں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھی۔ "کہئے غالب کی غزل لائے۔"

حشمت خاں کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ غزل کا کاغذ جیب سے نکالا اور بڑبڑایا۔ "لایا ہوں ۔ لو۔" چودھویں نے پر اشتیاق ہاتھوں سے کاغذ لیا تو حشمت خاں نے ذرا لہجے کو درشت کرتے ہوئے کہا۔ "پر غالب تو ابھی ابھی تمہارے کوٹھے سے اتر کر گئے ـــــ یہ ماجرا کیا ہے؟"

چودھویں چکرا سی گئی۔ "غالب ۔ میرے کوٹھے پر ۔ ابھی ابھی اتر کر گئے ۔ مجھے دیوانہ بناتے ہو ـــ میرا کوٹھا کہاں، غالب کہاں؟"

جمعدار نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ "واقعی سچ کہتا ہوں ۔ وہ غالب تھے جو ابھی

ابھی تمہارے کوٹھے سے اترے"۔

چودھویں اور زیادہ چکرا گئی"۔ جھوٹ؟

"نہیں چودھویں سچ کہہ رہا ہوں"۔

چودھویں نے پاگلوں کی طرح حشمت خاں کو دیکھنا شروع کیا "میری جان قسم غالب تھے؟ — جھوٹ — مجھکو بنا رہے ہو۔ اللہ سچ کہو۔ غالب تھے؟"

حشمت خاں بھناتا گیا "ارے تمہاری ہی جان کی قسم غالب تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف مرزا نوشہ جو اسد بھی تخلص کرتے ہیں"۔

چودھویں بھاگی ہوئی کھڑکی کی طرف گئی "ہائے میں مرگئی — غالب تھے"۔ نیچے جھانک کر دیکھا مگر بازار خالی تھا۔ "میرا ستیاناس ہو۔ میں نے اُن کی خاطر مدارات بھی نہ کی"۔

یہ کہہ کر اُس نے غزل کا کاغذ کھول کر دیکھا اور سر پیٹ لیا۔ "اللہ یہ خواب ہے یا بیداری۔ سچ ہے۔ تو وہ غالب ہی تھے۔ سو میں غالب ہزار میں غالب تھے۔ جمعدار صاحب۔ سچ کہا آپنے ضرور غالب تھے — ہائے میں نے اُن سے کہا۔ آپ غالب کے کلام کو کیا سمجھیں — میں مرجاؤں ... بھلا وہ کیا دل میں کہتے ہوں گے ... ہائے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے — اُف نہ معلوم میں کیا کیا اُن سے کہہ گئی"

یہ کہتے کہتے اُس نے غزل کا کاغذ منہ پر پھیلا لیا اور رونے لگی۔

[ام جھورلیا]

۱۵۶

کتبہ

یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔
اس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری
کے سارے اسرار و رموز دفن
ہیں — وہ اب بھی منوں مٹی
کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ
نگار ہے یا خدا

سعادت حسن منٹو

۱۸ اگست ۱۹۵۴ء